© rasailojaraid.com

سیّد نصرت بخاری

اُردو میں مکتوب نگاری کی روایت اور تحقیق میں اس کی اہمیت

[ا]

قدیم ترین انسان نے باہم گفتگو کے لیے جب الفاظ وضع کر لیے ہوں گے تو رو بہ رو گفتگو کے بعد دور دراز کے رہنے والوں سے اوّل اوّل قاصد کے ذریعے زبانی پیغام رسانی کی کوشش تو ضرور کی ہوگی۔ لیکن زبانی پیغام رسانی میں ایک قباحت تو یہ ہے کہ پیغام بر اپنے انداز سے اور اپنی ذہنی سطح کے مطابق بات آگے پہنچاتا ہے، جس سے لہجے کے اتار چڑھاؤ اور صوتی تاثر سے مطالب کی صورت اور مفہوم مسخ ہو جانے کا خدشہ بہر حال موجود رہتا ہے اور یوں غلط فہمی یا خوش فہمی کے بطون سے نت نئے تضاد اور فسادات جنم لیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ زبانی پیغام رسانی سے یہاں کا پیغام، وہاں تک سو فی صد پہنچنے کے امکانات بہت کم ہوتے ہیں، درمیان میں پیغام کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور گم ہو جاتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ حضور سرور کائنات نے جب بھی دور دراز کے عرب سرداروں اور پڑوسی حکمرانوں کو اسلام کی دعوت دی تو انھیں زبانی پیغام کے بجائے خط لکھا۔ آج کل کے ترقی یافتہ دور میں تو یہ کوئی اتنی تکلیف دہ بات محسوس نہیں ہوتی کہ اگر کوئی بات بھول گئی یا بتانے سے رہ گئی تو فوراً ہی بغیر کسی تردد کے دوبارہ فون یا موبائل پر رابطے کی سہولت موجود ہے جس سے بھول چوک کی تلافی ممکن ہے، لیکن اُس مذکورہ غیر ترقی یافتہ دور میں، جب اس قسم کی سہولیات کا تصور بھی محال تھا اور ذرائع آمد و رفت بھی ناپید تھے، یہ ایک بہت بڑی اذیت ہوگی۔ زبانی گفتگو اور پیغام رسانی کا ایک بڑا نقص یہ بھی ہے کہ اسے بطور سند یا بطور حوالہ نہیں برتا جا سکتا۔ زبانی پیغام بھیجنے اور پہنچانے والا کسی بھی وقت اپنے کہے ہوئے الفاظ کا انکار کر کے معاملات کو پیچیدہ بنا سکتا ہے۔ چنانچہ ایسے حالات میں جب کسی کے قول کے لیے تحریری شواہد کی ضرورت پڑی ہوگی اور بوقتِ ضرورت کام آنے والی کوئی تحریر موجود نہ ہوگی تو لوگوں کو ضرور کسی ایسی تحریر کی کمی کا احساس ہوا ہوگا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ خطوط نویسی ایسے ہی حالات کی ناگزیر پیداوار ہوگی۔ خط کی ایجاد بھی کچھ اتنی آسان نہ ہوگی۔ نہ جانے کتنی دقتوں، مشقتوں اور زمانی سفر کے بعد انسان نے اس لفظی وجود کو اختراع کیا ہوگا اور یہ اپنے عہد کی بہت حیرت انگیز ایجاد ہوگی، بالکل ایسی ہی حیرت انگیز جیسے آج کل کمپیوٹر، انٹرنیٹ اور موبائل فون ہیں۔ یوں:

> ''ذہنِ انسانی نے اپنی خداداد قوتِ مخترعہ سے کام لے کر خط ایجاد کیا اور ایسا نیا وسیلۂ گفتگو پیدا کر لیا جو نہ صرف زبان کا قائم مقام تھا بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو اپنی بے زبانی کے باوجود زبان سے بھی زیادہ شیوا بیان اور نطق سے بھی زیادہ فصیح اللسان تھا۔''[۱]

خط کو آدھی ملاقات کہا جاتا ہے لیکن یہ آدھی ملاقات پوری یعنی بالمشافہ ملاقات سے بھی زیادہ پائیدار اور دیرپا اثرات رکھتی ہے۔ کیونکہ بالمشافہ ملاقات کے دوران میں ہونے والی گفتگو ہوا میں تحلیل ہو کر اپنا وجود کھو دیتی ہے لیکن خط میں لکھے ہوئے معاملات، الفاظ اور ان کا مفہوم ہمیشہ ترو تازہ رہتا ہے۔ انھی اوصاف کی بدولت تمام محققین، نقاد، ادیب اور دانش وراس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بات پر متفق ہیں کہ خطوط اپنے اندر اتنی جامعیت اور اتنی وسعت رکھتے ہیں کہ ایک عہد کے خطوط میں اس وقت کا پورا عہد سانس لے رہا ہوتا ہے۔اس عہد کی زبان، علم و ادب، ذرائع معاش، بیماریاں، علاج معالجہ، معاشرتی تقاضے، تہذیب وثقافت، رسوم و رواج، سیاسی و مذہبی منظر نامہ، جغرافیہ، لوگوں کا طرزِ زیست، میلانات، رزم و بزم، حکمرانوں کا طرزِ بود و باش و اندازِ حکمرانی، زمانے کی کروٹیں غرض زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس کی تصویر خطوط میں نظر نہ آتی ہو۔منظر نگاری کی اس پیش کش میں مکتوب نگار کی شعوری کوشش شامل نہیں ہوتی بلکہ مکتوب میں یہ باتیں اپنا وجود خود پیدا کرتی ہیں۔اگر مکتوب نگار عالم ہے تو وہ اپنے عہد کے وہ علوم، جن پر اس کو دسترس حاصل ہے، کو محفوظ کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی صراحت کے علاوہ ارتقا کے مراحل سے ہمیں آگاہ کر رہا ہے اور اگر خط لکھنے والا کوئی مذہبی سکالر ہے تو وہ اپنے خط میں اس وقت کی مذہبی صورتِ حال، مذہبی تفصیلات، قرآنی آیات اور احادیث کی تشریحات، دینی مسائل و معاملات، فرقہ بندی کی تفصیلات، علما کے مابین اختلافات اور لوگوں کی وسعتِ قلبی و تنگ نظری کی روداد قلم بند کر رہا ہوتا ہے اور اگر وہ شاعر یا ادیب ہے تو اپنے اسلوبِ نگارش کے ساتھ ساتھ اپنے زمانے کے ادب، ادب و ادیب کے مسائل، ذاتی معلومات، مروجہ ادبی تحاریک، تحقیقی اصولوں اور تنقیدی رویوں کا غماز ہوتا ہے۔اگر وہ موسیقار ہے تو اس کے قلم سے موسیقی کے اسرار و رموز پھوٹ رہے ہوتے ہیں۔انھی خصوصیات کی وجہ سے ڈاکٹر سیّد عبداللہ نے اسے محیر العقول عجائبات میں شامل کیا ہے۔خطوط کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد اقبال رقم طراز ہیں:

> ''شاعر کے لٹریری اور پرائیویٹ خطوط سے اس کے کلام پر روشنی پڑتی ہے اور اعلیٰ درجے کے شعرا کے خطوط شائع کرنا لٹریری اعتبار سے مفید ہے۔''[۲]

اگرچہ یہاں پر بظاہر علامہ اقبال نے صرف شاعر یا شعرا کے خطوط کی اشاعت کا خصوصی طور پر مطالبہ کیا ہے اور یہ اس لیے ہے کہ ان کا روئے سخن ایک شاعر کی طرف تھا لیکن بین السطور یہ مفہوم بہرحال موجود ہے کہ اس سے ان کی مراد دراصل وہ تمام اہم ادیب، شاعر، علما اور سماجی و سیاسی شخصیات ہیں جن کا اپنے حلقہ اثر میں بہت رسوخ رہا ہو اور انھوں نے اپنی فکری میلان سے اردگرد کی فضا کو متاثر کیا ہو؛ اور مزید یہ کہ اس عہد اور آنے والے وقتوں میں لوگ ان کی زندگی کے شب و روز اور ان کے رجحانات و میلانات کے بارے میں جاننا چاہتے ہوں۔خط کے اسی اساسی پہلو کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ممتاز حسن نے علامہ اقبال کے خطوط کے بارے میں لکھا ہے:

> "Indeed ,I am more then certain that there is a great deal of material still awaiting discovery and compilation .This should particularly apply to letters"[۳]

ہمارے ہاں جب سے مشاہیر خصوصاً ادیبوں کے خطوط کی جمع آوری اور رسائل میں یا کتب کی صورت میں اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا ہے اور ناقدینِ فن نے ان کے اپنے مکاتیب کی روشنی میں سائنسی انداز اختیار کرتے ہوئے ان کی تحریروں، ان کے افعال و اعمال اور زندگی کے شب و روز کو دیکھنا شروع کیا ہے اور ان کی مدد سے کڑی سے کڑی ملاتے ہوئے بعض خفیہ اور ناگفتنی معلومات کے حصول کے علاوہ نامہ نگار کی باطنی دنیا تک پہنچ گئے ہیں؛ تو ہر سطح اور ہر مکتبہ فکر کے مشاہیر نے محتاط یا خوف زدہ ہو کر اوّل تو ہر کس و ناکس کو خط لکھنا ہی چھوڑ دیا ہے اور اگر بحالتِ مجبوری لکھا بھی تو قلم سنبھال کر خط لکھنے کا ڈھنگ اپنا لیا ہے۔وہ ایسا اس لیے کرتے ہیں کہ ان کے خط سے کوئی منفی کام نہ لیا جائے اور:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

''اعتراف جرائم کی فہرست یا نامہ اعمال کے ایک ٹکڑے کے طور پر اسے استعمال نہ کیا جاسکے۔''[۴]

لیکن اس کے باوجود بے ساختہ اور برجستہ ہونے کی وجہ سے خط کا کوئی نہ کوئی جملہ یا نکتہ کہیں نہ کہیں ایسا دریچہ کھول دیتا ہے جس سے مکتوب نگار کی وارداتِ قلبی کے ساتھ ساتھ اس کے عہد کے بعض ایسے صاف، واضح اور بعض اوقات چونکا دینے والے نقوش برآمد ہوتے ہیں کہ اس سے معاشرے میں پہلے سے موجود تصورات کے سارے خد و خال ایک نئی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور اس نئی صورت سے مذہبی، معاشرتی، سیاسی اور عمرانی فضا پوری طرح متاثر ہوتی ہے۔

''یہاں پہنچ کے خطوط ایک تاریخی دستاویز کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور ہماری رہنمائی کرتے نظر آتے ہیں۔ مورخ کے نزدیک یہی خطوط قابلِ اعتبار اور اہمیت کے حامل ہوتے ہیں''۔[۵]

کتنے ہی ایسے واقعات ہیں کہ جن کے متعلق جبراً، لاعلمی، عجلت، مصلحتاً، دانستہ یا نادانستہ طور پر کیے گئے غلط فیصلوں کو تسلیم کرتے ہوئے وقت اپنی مٹی ڈال چکا تھا لیکن کسی ایک خط یا خطوط کی دریافت سے حالات نے پلٹا کھایا اور صحیح صورتِ حال منظرِ عام پر آ گئی اور مسخ شدہ حقائق جب نئے سرے سے مرتب ہونے لگے تو پھر ان کا رنگ کچھ اور ہی ہوگیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی، جس میں انگریزوں نے مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں پر مشتمل ہندوستانی فوج کو بڑی آسانی سے شکست دے کر پورے برِ صغیر پر اپنا تسلط قائم کر دیا۔ اس جنگ میں ہندوستانی فوج کی شکست کے اسباب پر بحث کرتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ ہندوستانی غیر منظم، غیر تربیت یافتہ اور جنگی رموز سے نا آشنا جب کہ انگریز منظم، متحد، اور جنگی حربوں سے پوری طرح آگاہ تھے۔ ہندوستانی فوج کے پاس اس قسم کے جدید ہتھیار نہیں تھے جو انگریز فوجیوں کے پاس تھے، انھیں خوراک کی قلت اور تنخواہ کے مسائل کا سامنا تھا اس لیے وہ پست ہمت دلجمعی سے لڑائی نہ لڑ سکے اور نتیجے کے طور پر انھیں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

مندرجہ بالا اسباب کو حقائق سمجھتے ہوئے دنیا نے تسلیم کیا اور تاریخ نے مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔ یہ غلط اسبابِ شکست ایک عرصے تک پڑھے اور پڑھائے جاتے رہے اور لوگ ان پر ایمان لاتے رہے، لیکن اسی جنگ کے حوالے سے برٹش میوزیم، انڈیا آفس لائبریری اینڈ ریکارڈ میں ایک عرصے سے محفوظ غداروں کے خطوط تو کوئی اور ہی روداد بیان کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ خطوط ان ننگِ قوم اور ننگِ وطن غداروں کے منہ سے نقاب کھینچتے ہیں جو اس شکست کا اصل سبب تھے۔ اگرچہ ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں پر مشتمل اس غدار ٹولے میں چند لوگ تھے لیکن انھوں نے ہندوستانی فوج کو نا قابلِ تلافی نقصان پہنچایا۔ یوں تو تمام غدار ہی انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی تگ و دو میں حریت پسندوں کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچا رہے تھے لیکن ان سب میں سے مولوی رجب علی زیادہ نقصان دہ ثابت ہوا کیوں کہ یہ شخص بادشاہ کا خاص آدمی ہونے کی وجہ سے اس کی مجلسِ مشاورت کا رکن اور بارود خانے کا انچارج تھا۔ ۱۷/ اگست ۱۸۵۷ء کو انقلابیوں کے بارود خانے میں آگ لگنے سے پانچ سو سے زائد حریت پسند شہید ہوئے تھے، اور یہ کارنامہ اسی مولوی رجب علی کا تھا۔ اس کی وفاداری اور غداری کا سربستہ راز کبھی نہ کھلتا اگر انڈیا آفس لائبریری سے یہ خطوط برآمد نہ ہوتے۔ ۱۵/ ستمبر ۱۸۵۷ء کو ایک خط میں انگریزوں سے وفاداری نبھاتے ہوئے انھیں لکھتا ہے:

''میں آپ [انگریز افسر] کے حکم کی تعمیل میں خبریں حاصل کرنے کے لیے شہر کی فصیل کے قریب گیا تھا۔ یہاں پر زخمی سپاہیوں سے لدی ہوئی بے شمار ڈولیاں موجود تھیں...سنا ہے کہ باقی فوج کے سب دستے قطب جانے والی سڑک اور دوسرے راستوں سے ریواڑی کی طرف بھاگ رہے ہیں لیکن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اجمیری دروازے کے قریب ابھی بھی ان کی ایک بڑی تعداد موجود ہے...شہر کے جس جس حصہ میں ہمارا [یعنی انگریزوں کا] قبضہ ہوا ہے وہاں کی تمام دکانیں لوٹ لی گئی تھیں۔''[6]

بعض خطوط ایسے ہیں کہ جنھوں نے تاریخ پر بہت گہرے اور ان مٹ نشان چھوڑے ہیں۔ ایسا ہی ایک خط حضرت عثمان غنیؓ سے منسوب ہے۔ اگرچہ حضرت عثمان غنیؓ نے اس خط کو اپنا خط ماننے سے انکار کیا تھا لیکن اس کے اثرات آج تک موجود ہیں اور رہتی دنیا تک رہیں گے۔ اس خط کے نتیجے میں نہ صرف حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت ہوئی بلکہ یہ خط امیر معاویہؓ اور حضرت علیؓ کے مابین کئی جنگوں کا سبب بھی بن گیا جس سے مسلمان دو گروہوں شیعانِ علی اور شیعانِ معاویہ میں تقسیم ہو کر ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے گئے؛ اور یہ بڑھتے ہوئے فاصلے آج ایک وسیع خلیج کی صورت اختیار کر گئے ہیں جس کو کسی صورت پُر نہیں کیا جا سکتا۔ یہی خط حضرت امام حسینؓ کی شہادت کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ اس خط کے متعلق حضرت علامہ جلال الدین سیوطی نے اپنی کتاب لکھا ہے:

> ''اہلِ مصر نے ابن ابی سرح کی آ کر شکایتیں کیں۔ حضرت عثمانؓ نے ایک تہدید نامہ عبداللہ بن ابی سرح کو لکھا مگر اس نے اس خط کی کوئی پروا نہ کی اور جن باتوں سے حضرت عثمان غنیؓ نے منع کیا تھا؛ انھیں کرنے لگا اور جو اہلِ مصر حضرت عثمان غنیؓ کے پاس شکایت لے کر آئے تھے؛ انھیں قتل کرا دیا...ادھر حضرت عائشہؓ کو خبر ہوئی تو آپ نے کہلا بھیجا کہ اصحابِ محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم آپ سے ایسے شخص کے متعلق؛ جس پر قتل کا الزام ہے؛ کی معزولی کے متعلق کہتے ہیں مگر آپ کچھ پروا نہیں کرتے اور اس کے معزول کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ تھوڑی دیر میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ تشریف لائے اور آپ نے بھی کہا...آپ اس معاملہ میں ت کیوں نہیں برتتے؟ آپ [حضرت عثمانؓ] نے فرمایا کہ لوگ اپنے لیے خود ہی تجویز کر لیں۔ اس پر لوگوں نے محمد بن ابوبکر کا انتخاب کیا۔ چنانچہ آپؓ نے ان کی تقرری اور عبداللہ بن سرح کی معزولی کا فرمان تحریر کر دیا...یہ سارا قافلہ محمد بن ابوبکر کے ہمراہ مدینہ طیبہ سے ابھی تیسری ہی منزل پر تھا کہ ان کو ایک حبشی غلام جو اپنی سانڈنی کو اڑائے ہوئے تیزی کے ساتھ لیے جاتا تھا؛ ملا...صحابی نے اس کو پکڑ لیا...اس نے کہا میں امیر المومنین کا غلام ہوں اور عاملِ مصر کے پاس جاتا ہوں۔ یہ سن کر ایک شخص نے محمد بن ابی بکر کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ عاملِ مصر یہ ہیں۔ اس نے کہا کہ میرے مکتوب الیہ یہ نہیں...اس کی تلاشی لی گئی تو [مشکیزے سے] ایک خط امیر المومنین کی طرف سے ابنِ ابی سرح کے نام کا نکلا...اس میں لکھا تھا کہ جس وقت تیرے پاس محمد اور فلاں فلاں اشخاص آئیں تو کسی حیلے سے انھیں قتل کر دینا۔ اس خط کو پڑھ کر تمام آدمی دنگ رہ گئے اور مدینہ طیبہ لوٹنے کا مصمم ارادہ کر لیا...آپ [حضرت عثمانؓ] نے فرمایا میں حلفیہ کہتا ہوں کہ یہ خط میں نے نہیں لکھا اور نہ میں نے کسی کو لکھنے کا حکم دیا اور نہ مجھے اس کے متعلق کچھ معلوم ہے...اس کے بعد لوگوں نے پہچانا کہ یہ مروان کا خط ہے۔''[7]

خدا جانے مروان نے کس وقتی فائدے کے حصول کے لیے یہ جعلی خط لکھا تھا؛ مگر اس خط نے مسلمانوں کو دشمنوں سے بھی زیادہ نقصان پہنچایا۔ کاش یہ خط نہ لکھا جاتا۔ اگر یہ خط نہ لکھا جاتا تو مسلمانوں کی تاریخ کی صورت کچھ اور ہی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوتی۔ مسلمانوں کے مابین اگر اختلاف ہوتا بھی تو ایسا شدید نہ ہوتا جیسا اب ہے۔ مروان نے اس خط کے ذریعے اسلام کی پرسکون ندی میں ایسا پتھر مارا جو طوفان کی صورت اختیار کر گیا۔ نتیجے کے طور پر ایسا سوراخ ہوا جواب شگاف کی صورت اختیار کر گیا ہے اور جس کو پُر کرنا اب عام آدمی کے بس کی بات نہیں۔ اس خط نے مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے قدم روک لیے۔ یہیں سے مسلمانوں کی ترقی، تنزلی میں تبدیل ہوتی نظر آتی ہے۔ بیرونی فتوحات کا سلسلہ موقوف ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ عام مسلمان کو چھوڑیے؛ اصحاب رسول ﷺ گروہوں میں تقسیم ہو کر ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہونے لگے ہیں۔ مسلمان، مسلمان پر اپنی تلوار کے جوہر آزما رہا ہے۔ اندرونی ٹوٹ پھوٹ کی وجہ سے مسلمان کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔ اس خط کی ان مہلک اثرات کے علاوہ ایک اور لحاظ سے بھی اہمیت ہے کہ یہ مسلمانوں کی تاریخ میں پہلا جعلی خط ہے لیکن تاریخ عالم میں جعلی خط کی یہ کوئی واحد مثال نہیں۔ محمد قاسم فرشتہ اپنی تالیف تاریخ فرشتہ میں کئی ایک جعلی خطوط کا ذکر کرتا ہے۔ ان میں سے ایک مع سیاق وسباق یوں ہے:

> راجہ مالدیو نے حکومت وراثت میں حاصل نہیں کی تھی بلکہ اس علاقے کے تمام راجاؤں کو زیر کر کے مہاراجہ بنا تھا۔ مظلوم راجاؤں نے موقع پا کر شیر شاہ سے پناہ مانگی۔ شیر شاہ کے مشورے سے ان راجاؤں نے مالدیو کے افسروں اور سرداروں کی طرف سے شیر شاہ کے نام ہندی زبان میں [جعلی] خطوط لکھے؛ جن کا مضمون یہ تھا ''ہم لوگ مجبوراً مالدیو کی اطاعت کر رہے ہیں اور ہم نے کسی غیبی امداد کے بھروسے پر راجہ کے ظلم وستم برداشت کیے۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ جیسا بادشاہ اس ملک پر حملہ آور ہوا ہے تا کہ اس ظالم سے ہمارے بدلے لے۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ جس وقت آپ کی فوج یہاں پہنچ جائے گی؛ ہم مالدیو سے علیحدہ ہو کر آپ کی مدد کریں گے''۔ ان [جعلی] خطوط کے مضمون کے مطابق شیر شاہ کا [فرضی] جواب بھی بادشاہ کی طرف سے اسی طرح لکھا گیا کہ ''اگر خدا نے چاہا تو میں مالدیو کو شکست دے کر تمھاری دادرسی کروں گا اور تمھارے موروثی علاقے تمھیں دے کر تمھارے مراتب بلند کروں گا۔ تم لوگوں کو چاہیے کہ صبر وسکون کے ساتھ میرا ساتھ دو''۔ ۸

جعلی خطوط کا یہ سلسلہ ابھی موقوف نہیں ہوا۔ اب بھی جعل ساز اپنے مقاصد کے حصول کے لیے نت نئے انداز سے جعلی خطوط لکھتے اور استعمال کرتے ہیں۔ ہمارے عہد میں بھی پیسے اور شہرت حاصل کرنے کے لیے مشاہیر کے نام سے جعلی خطوط لکھ کر دنیا کے سامنے پیش کیے گئے لیکن ناقدین کی نظروں سے بچ نہ سکے اور مختلف انداز اور زاویوں سے محققین نے جب ان خطوط کا تجزیہ کیا تو وہ جعلی ثابت ہو گئے۔ اردو ادب میں سب سے اہم خطوط غالب کے ہیں اس لیے سب سے زیادہ جعل سازی بھی غالب کے نام پر ہوئی۔ اس کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

> ''[ماسٹر اختر نے] نے پہلے تو علامہ اقبال کے نام غالب کا ایک خط لکھا اور پھر میرے [خلیق انجم] مرتبہ خطوطِ غالب میں شامل غالب کے اصلی خطوط کے عکس نکال کر اس کے الفاظ کاٹ کاٹ کر اپنے لکھے ہوئے خط کے مطابق ترتیب دے دیے''۔ ۹

> ''غالب کے جعلی خطوط کا دلچسپ ترین معاملہ ''نادر خطوطِ غالب'' ہے۔ غالب کے اس مجموعے کے مرتب سید محمد اسماعیل رسا ہمدانی گیاوی ہیں...۔ جب خطوط کا یہ مجموعہ شائع ہوا تو دونوں [مالک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رام، قاضی عبدالودود] نے اس مجموعے کے تمام خطوط کو غالباً ایک کے علاوہ جعلی قرار دے دیا''۔۱۰

''جلال صاحب نے غالب کے خطوط کا ایک [جعلی] مجموعہ تیار کیا تھا لیکن ماہرین غالب کے تیور دیکھ کر خائف ہو گئے''۔۱۱

مولانا الطاف حسین حالی نے ''یادگارِ غالب'' میں دانستہ یا نادانستہ یا کسی وقتی مجبوری کے تحت یا خوفِ فسادِ خلق کے پیشِ نظر مصلحتاً غالب کے مسلک پر روشنی نہیں ڈالی اور غالب کے جنازے میں شرکت کے باوجود؛ اس واقعے کو ایسے گول مول بیان کیا کہ ابہام رہ گیا جس سے بعد میں مغالطہ پیدا ہو گیا۔ یہاں تک کہ عبدالصمد صارم نے تو مقامِ غالب میں

غالب نام آورم نام و نشانم مپرس
هم اسد اللهیم هم اسد اللهیم

جیسے اشعار کا کمزور سہارا لے کر غیر تحقیقی انداز سے انھیں راسخ العقیدہ شیعہ قرار دے دیا اور پھر اسی جرم کی سزا دیتے ہوئے نہایت تعصّب سے ان کے کلام میں خوبیوں کو بھی خامیوں میں تبدیل کرتے رہے؛ ان کا یہ تعصّب مذکورہ کتاب میں جگہ جگہ واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔ اگر صرف حضرت علی سے محبت کرنے یا ان کی شان میں شعر کہنے سے کوئی شیعہ ہوتا ہے تو پھر عبدالصمد صارم جیسے محقق اردو ادب کے نوے فی صد شعرا کو شیعہ ہی قرار دیں گے۔ غالب کے چند اشعار کو بنیاد بنا کر اسی طرح کا ایک دعویٰ سید اولاد حسین شاداں بلگرامی نے بھی کیا تھا؛ لکھتے ہیں:

''جاں پناہا، دل و جاں فیض رسانا شاہا
وصی ختم رسل تو ہے بفتوائے یقیں

اہلِ تسنن حضرت علی کو وصی کب مانتے ہیں۔ یہی وصایت تو شیعہ و سنی میں باعثِ نزاع ہے۔ اگر سنی وصی مانتے ہوتے تو پھر جھگڑا ہی کیا تھا۔۔۔ اتنا کچھ ہوتے ہوئے پھر بھی حضرتِ غالب کو سنی تفضیلی کہنا محض ہٹ دھرمی نہیں تو اور کیا ہے۔''۱۲ یہاں دل چسپ نکتہ یہ ہے کہ صارم صاحب نے تعصب برتے ہوئے غالب کو شیعہ قرار دیا جب کہ بلگرامی صاحب نے وفورِ شوق میں انھیں اپنے گروہ میں شمار کیا ہے۔ مولانا عبدالباری نے بھی ''شرح دیوانِ غالب میں انھیں شیعہ ہی لکھا ہے۔ اسی طرح شیخ محمد اکرام نے بھی...ان کا مسلک شیعہ ہی درج کیا ہے۔

اگر یہ دعویٰ کرنے والے تحقیق کا سہارا لیتے اور غالب کے خطوط کا مطالعہ کر لیتے تو ان کی تحقیق گمراہ کن نہ ہوتی۔ مرزا غالب کے ایک مکتوب، بہ نام مہدی حسین مجروح، میں اس نظریے کی تردید ملتی ہے ملاحظہ کیجیے

''میر مہدی! تم میرے عادات کو بھول گئے۔ ماہِ مبارک رمضان میں کبھی مسجد جامع کی تراویح ناغہ ہوئی ہے؟ میں اس مہینے میں رام پور کیونکر رہتا، نواب صاحب مانع رہے، اور بہت منع کرتے رہے، برسات کے آموں کا لالچ دیتے رہے۔ مگر بھائی! میں ایسے انداز سے چلا کہ چاند رات کے دن یہاں آ پہنچا، یک شنبہ کو غرّہ ماہِ مقدس ہوا۔ اسی دن سے ہر صبح کو حامد علی خاں کی مسجد میں جا کر جناب مولوی جعفر علی صاحب سے قرآن سنتا ہوں۔ شب کو مسجد جامع جا کر نماز تراویح پڑھتا ہوں۔''۱۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ بات ہر خاص و عام کے علم میں ہے کہ اہلِ تشیع کے ہاں نمازِ تراویح کا اس طرح کا اہتمام نہیں ہوتا جیسا کہ غالب نے اپنے خط میں ماہِ رمضان میں اپنا معمول بتایا ہے۔ یہی خط غالب کو سُنی ثابت کرتا ہے اور ضیاء الدین احمد خان نے جوان کی تدفین کے تمام مراسم اہلِ سنت کے طریقے پر ادا کیے، وہ یونہی نہیں تھے۔ اسی ایک مثال سے یہ سبق سیکھنا چاہیے کہ کسی شخصیت کے متعلق کوئی حتمی رائے دینے سے پہلے اس کی تمام تحریریں خاص کر خطوط اگر دستیاب ہوں تو مطالعہ ضرور کر لینا چاہیے۔ اس لیے کہ خطوط نہایت اہم تحقیقی ماخذ ہوتے ہیں اور اگر یہ ضائع ہو جائے تو گویا ایک پوری تاریخ یا باب گم ہو جاتا ہے۔

اس قسم کے خطوط اگرچہ سوانح عمری کے زمرے میں نہیں آتے لیکن سوانح عمری کے لیے مستند مواد ضرور فراہم کرتے ہیں۔ غلام رسول مہر نے غالب کے خطوط سے حالات و واقعات لے کر ان کی سوانح عمری ترتیب دی تھی؛ ان کے تتبع میں محمد عبداللہ قریشی نے خطوطِ اقبال سے اقبال کی آپ بیتی مرتب کی؛ لکھتے ہیں:

> ''کچھ عرصہ ہوا میں نے اقبال کے بعض خطوں کے ٹکڑے خاص ترتیب اور سلیقے سے جوڑ کر ان کی آپ بیتی [سوانح عمری؟] مرتب کرنے کا تجربہ کیا؛ جو بے حد کامیاب ہوا''۔[۱۴]

خطوط چوں کہ بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں اور ٹھوس حقائق اور قطعی معلومات کے حصول کے لیے بنیادی ماخذات بہت اہمیت رکھتے ہیں؛ اس لیے مشاہیر کی سوانح عمری یا تاریخ لکھنے والے اگر ان کے دستیاب خطوط سے استفادہ نہ کریں تو ان کے لکھے ہوئے مواد میں جھول اور کمی بیشی کا دھڑکا ہمیشہ لگا رہتا ہے۔ کوئی بھی شخص کسی بھی وقت خطوط کو بطور دلیل پیش کر کے ان کے لکھے ہوئے کو جھٹلا کر ان کی محنت پر پانی پھیر سکتا ہے۔ مثال کے طور پر اورنگ زیب عالم گیر کے متعلق لکھتے وقت کئی ہندو مورخین نے اس کی اسلام پسندی کی وجہ سے تعصب سے کام لیا، جواب میں دفاع کرتے ہوئے بعض مسلمان مورخین اس کی کوتاہیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے ولی اللہ کے درجے پر لے گئے۔ جب کہ یہ دونوں آراء حقیقت سے بہت دور ہیں اور قاری کو گمراہ کرتی ہیں۔ اورنگ زیب کی اصلی معاشرتی صورت اگر دیکھنا مقصود ہو تو اس کے رقعات سے بہتر کوئی اور چیز نہیں۔ ایسی صورتِ حال میں مکاتیب کی اہمیت تاریخی کتب سے بڑھ جاتی ہے۔ اسی وجہ سے مشاہیر کی زندگی پر لکھنے، پڑھنے والوں کو اس کے خطوط بھی پیشِ نظر رکھنے چاہیں کیوں کہ بعض اوقات خط میں مکتوب نگار ایسی ذاتی معلومات لکھ دیتا ہے جو اس نے کہیں اور درج نہیں کی ہوتیں۔

> ''چوں کہ [خط] لکھنے والے کو یہ کبھی خیال بھی نہیں آتا کہ اس کے یہ پوشیدہ اعترافات کبھی منظرِ عام پر آئیں گے... اس لیے وہ نہایت بے تکلفی کے ساتھ اپنا ہر حال اور خیال بے پس و پیش حوالہ قلم کرتا جاتا ہے، اس لیے اس آئینہ میں انسان ویسا ہی نظر آتا ہے جیسا کہ وہ در حقیقت ہے''۔[۱۵]

اسی قسم کا ایک خط احمد ندیم قاسمی نے ۱۴/ جنوری ۱۹۷۹ء کو خواجہ محمد خان اسد کو لکھا تھا۔ اگر کوئی شخص احمد ندیم قاسمی کی سوانح عمری لکھنے کا بیڑہ اُٹھائے تو یہ خط اس کے لیے بنیادی ماخذ کے طور پر بہت کارآمد ثابت ہوگا:

> ''میں اعوان ہوں۔ بزرگوں میں پیری مریدی کا سلسلہ تھا اس لیے خاندان کے بعض افراد کے نام کے ساتھ ''شاہ'' کا لاحقہ لگا دیا گیا، حالانکہ میرے بڑے بھائی کا نام محمد بخش ہے۔ پھر مولانا محمد قاسم نانوتوی سے بھی میرا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ میں قاسمی اس لیے ہوں کہ میرے دادا کا اسمِ گرامی محمد قاسم تھا اور اسی حوالے سے ہمارا خاندان قسمال (قاسم آل) کہلاتا ہے۔ میں نے قسمال

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کو قاسمی میں بدل دیا۔‘‘[۱۶]

ڈاکٹر وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی کے مابین چپقلش کا تو ہر خاص و عام کو علم ہے کیوں کہ اسی کی بدولت پاکستان میں اردو ادب کا بڑا دھارا دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ اس گروہ بندی نے پاکستانی ادب پر بہت منفی اثرات مرتب کیے۔ دونوں اطراف کے ادیبوں اور ناقدین نے اپنی توانائیاں ایک دوسرے کے استرداد اور ایک دوسری کی ذات پر کیچڑ اچھالنے میں ضائع کر دی۔ ایک دوسرے کو بدنام کرنے کے لیے کتابیں لکھی گئیں اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ اپنے آپ کو ان گروہوں سے منسلک کرنے والوں سے اگر اس مناقشے کے اسباب و آغاز کے متعلق پوچھا جائے تو شاید چند لوگ ہی بتا سکیں، وہ بھی اس انداز سے کہ اپنا گروہ بے قصور اور معصوم نظر آئے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا ایک خط جو انھوں نے انور سدید کے نام لکھا تھا؛ اس جھگڑے کی ابتدا اور آغاز کے متعلق معلومات فراہم کرتا ہے۔ یہ ایک چھوٹی سے غلط فہمی تھی جو بڑھتے بڑھتے پاک بھارت جنگ کا روپ اختیار کر گئی۔ اس خط میں وزیر آغا صاحب لکھتے ہیں:

> ’’میرا خیال ہے کہ وہ [احمد ندیم قاسمی] مجھ سے ناراض ہیں۔ اس کی کوئی اور وجہ تو نظر نہیں بجز ایک وجہ۔ جب ’’اوراق‘‘ کا پہلا شمارہ نکلا تو اس میں فتح محمد ملک صاحب کا ایک مضمون چھپا جس میں انھوں نے فیض اور ندیم کا موازنہ بھی کیا تھا۔ مضمون فیض کی مخالفت میں تھا۔ چوں کہ ادبی حلقوں میں یہ بات عام ہے کہ ان دنوں فیض اور ندیم کے مابین معاصرانہ چشمک ہے... سو میں نے مضمون میں سے بعض قابل اعتراض حصے حذف کر دیے‘‘۔[۱۷]

کسی ادیب کا سوادِ تحریر محفوظ کرنے کے لیے بھی خط سے زیادہ اہم کوئی اور چیز نہیں۔ کیوں کہ اس دور میں کوئی شخص اپنی تخلیقات کے مسودے دوسرے کے ہاتھ میں نہیں دیتا اور پھر آج کل تو کمپیوٹر، ای میل اور کمپوزنگ کا دور ہے۔ سہولت اور وقت کی بچت کے پیشِ نظر مسودے کمپوز ہو کر ادھر ادھر رائے یا دوسری ضروریات کے لیے جاتے ہیں اور اخبارات و رسائل تک جو مواد پہنچتا ہے ایک تو وہ بھی کمپوز ہو کر جاتا ہے یا ای میل کر دیا جاتا ہے، اس کے علاوہ انھیں کوئی محفوظ کرنے کا جتن بھی نہیں کرتا۔

اگر چہ آج کل بعض لوگ خط بھی کمپیوٹر پر لکھنے لگے ہیں، تاہم ادیب لوگوں کی باہمی خط کتابت میں ابھی یہ رجحان بہت کم ہے، اور آج سے پانچ سات سال پہلے تو بالکل بھی نہیں تھا اور پانچ سات سال بعد تو ہر آدمی کمپوزنگ ہی سے استفادہ کرے گا۔ بلکہ اکثر اخبارات و رسائل کمپوز شدہ یا ای میل کے ذریعے موصول ہونے والے مواد کو ابھی سے زیادہ ترجیح دینے لگے ہیں۔ اب جب کہ خط اور دیگر تحاریر ہاتھ سے لکھنے کی بجائے کمپیوٹر کے ذریعے کمپوز ہونا شروع ہو گئی ہیں تو سوادِ تحریر اور دستخطوں کو محفوظ کرنا اور بھی ضروری ہو گیا ہے وہ اس لیے کہ آنے والے زمانے میں کوئی جعل ساز کسی ذاتی اور وقتی مفاد کے لیے آنے والی نسلوں کو آج کے کسی بڑے ادیب یا معروف شخصیت سے کوئی ایسی فرضی تحریر، مضمون، مقالہ یا قلمی نسخہ منسوب کر کے دھوکہ نہ دے سکے۔ ایسی جعلی تحریر اس جعل ساز کو وقتی فائدہ دینے کے ساتھ ساتھ کسی شخصیت یا ادیب کی دائمی رسوائی کا سبب بن سکتی ہے۔ چنانچہ ایسے واقعات کے ظہور ہونے سے پیشتر حفظِ ماتقدم کے طور پر معروف شخصیات کا سوادِ تحریر محفوظ کرنا بہت ضروری ہے۔ گیان چند جین کہتے ہیں: انگریزی میں

"THE HAND WRITING OF ENGLISH DOCUMENTS. اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

EXAMPLES OF ENGLISH HAND WRITING. جیسی حوالہ جاتی کتب موجود ہیں۔ چنانچہ ضرورت ہے کہ اردو میں بھی ایسے مجموعے تیار کیے جائیں جن میں اردو کے ماضی وحال کے ادیبوں کے خط کے نمونے ہوں۔۔۔۔جموں یونی ورسٹی میں ناسخ کا ایک غیر مردف قلمی دیوان خریدا گیا۔اس کے بعض مصرعوں کو کاٹ کر حاشیے میں اصلاحیں درج ہیں۔ مجھے (گیان چند جین کو) تلاش ہوئی کہ ناسخ کی لکھائی کا کوئی نمونہ مل جائے تو اس سے مقابلہ کرلوں۔کوئی مخزنِ تحریر ادبا ہوتی تو سہولت ہوتی۔"۱۸

حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے مختلف اوقات میں مختلف صحابہ کرامؓ سے اپنے خطوط لکھوانے کا کام لیا تھا جو انھوں نے متعدد بادشاہوں کے پاس بھیجے: "جن میں انھیں اسلام کی دعوت دی گئی۔۔۔اور وہ خطوط بعینہٖ ان بادشاہوں کے میوزیم میں موجود ہیں"۱۹

اب تک دستیاب تین سو مکتوباتِ مقدس میں سے تین خطوط کی تحریر کو سوادِ تحریر کی مطابقت کی وجہ سے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے منسوب کیا گیا ہے۔ چنانچہ سوادِ تحریر کو محفوظ کرنے کے لیے اس وقت خطوط سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہیں کیوں کہ دوسری اصناف ادب مثلاً شاعری، ناول، افسانے اور تنقید کو ادبا، شعرا اور ناقدین پہلے کاتبوں سے لکھواتے یا خود لکھتے تھے اور اب کمپوزر سے کمپوز کرانے لگے ہیں یا تخلیقات کو ای۔میل کر دیا جاتا ہے۔صرف خط ہی ایسی تحریر رہ گئی ہے جس کو اکثر وبیشتر قلم خود لکھتے آئے ہیں، اور اس وقت تک اردو ادب میں جتنے بھی مکاتیب کے مجموعے یا رسائل کے مکاتیب نمبر شائع ہو چکے ہیں ان میں اکثر ایسے ہیں جن میں نمونے کے طور پر مشاہیر کے اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے چند ایک خطوط کے عکس چھاپے گئے ہیں۔محمد طفیل نے رسالہ نقوش کے مکاتیب نمبر میں "عکسی خطوط" کا باقاعدہ باب قائم کرتے ہوئے مرزا غالب، مولانا الطاف حسین حالی، سرسیّد احمد خاں، مولانا محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد، ڈاکٹر محمد اقبال، شبلی نعمانی، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی جوہر، وحید الدین سلیم، سیّد احمد دہلوی، مولانا راشد الخیری، حکیم اجمل خاں، سر عبدالقادر، ظفر علی خاں، سیّد سلیمان ندوی، غلام بھیک نیرنگ، منشی پریم چند، مولانا عبدالحلیم شرر، فانی بدایونی، اختر شیرانی، خواجہ حسن نظامی، محمود شیرانی، میرزا یگانہ چنگیزی اور سیّد سجاد حیدر یلدرم جیسی اہم شخصیات سمیت چھپن ادیبوں کے خطوں کے عکس دیے ہیں۔اس طرح انھوں نے نقوش خطوط نمبر دو ہزار دو سو تریپن غیر مطبوعہ خطوط شائع کیے؛ اور اس میں جنون، داغ دہلوی، امیر مینائی، غلام قادر گرامی، نواب وقار الملک، مولانا ابوالکلام آزاد، سید علی بلگرامی، سید حسین بلگرامی، عزیز لکھنوی، رام بابو سکسینہ، ریاض خیر آبادی، سر عبدالقادر، حبیب الرحمٰن شیروانی، مولوی عبدالحق، عبدالرحمٰن بجنوری، مولوی ممتاز علی، اکبر الہ آبادی، احمد علی شوق، عبدالحلیم شرر، نصیر حسین خیال، قاضی عبدالغفار، آرزو لکھنوی، غلام عباس، نواب بہادر یار جنگ، فانی بدایونی، جگر مراد آبادی، رضا علی وحشت، دل شاہ جہان پوری، عبدالمجید سالک، عبیداللہ سندھی، اسلم جیراجپوری محشر لکھنوی، حامد حسن قادری، مولوی محمد شفیع، شوکت تھانوی، میرزا یگانہ، اثر لکھنوی، اختر شیرانی اور شاہ دل گیر کے عکسی خطوط کی اشاعت کا اہتمام کیا ہے۔ چنانچہ اس وقت دعوے سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ مندرجہ بالا بیشتر مشاہیر کی تحریر کا نمونہ ان عکسی خطوط کے علاوہ اور کہیں دستیاب نہ ہوگا۔برِ صغیر میں خطوط کی کتابوں میں سوادِ تحریر کو محفوظ کرنے کا رجحان کوئی نئی بات نہیں رقعاتِ عالم گیری میں بھی اورنگ زیب عالم گیر کے دو خطوط کے عکس ملتے ہیں۔اسی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

روایت کی تقلید میں خطوطِ اقبال مرتبہ رفیع الدین ہاشمی میں اقبال کے اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے (۹) اہم خطوط کے عکس دیے گئے ہیں۔خطوطِ عبدالحق بنام ڈاکٹر عبداللہ چغتائی میں مولوی عبدالحق صاحب کے ہاتھ سے لکھے دو خطوط کے عکس موجود ہیں۔رسالہ انشا حیدر آباد، جنوری تا مارچ،۲۰۰۲ء، ڈاکٹر نجم الاسلام نمبر میں ڈاکٹر مختار الدین احمد، پروفیسر نظیر صدیقی، ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی ،ایم سلطانہ بخش، پروفیسر سیّد محمد سلیم، ظہیر صدیقی، ڈاکٹر ظفر اقبال، ابو سعادت جلیلی، سمیت اٹھارہ مشاہیر کا سوادِ تحریر محفوظ کیا گیا ہے۔خواجہ محمد خان اسد (احوال و آثار) میں مرتب راشد علی زئی نے مولانا غلام رسول مہر، مولانا شاہ معین الدین ندوی ،مولانا سید عبدالقدوس ہاشمی، ڈاکٹر محمد ایوب قادری، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کے خطوط کے عکس شائع کیے ہیں۔مکاتیب عزیز میں مرتب کپتان عبداللہ نے غلام ربانی عزیز کے تین خودنوشت خطوط کا عکس پیش کیا ہے۔ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے مکاتیبِ مشفق خواجہ بنام ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی میں اور ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد نے مکاتیبِ رشید حسن خاں بنام رفیع الدین ہاشمی میں بھی مکتوب نگاروں کے دست نوشت چند ایک خطوط کے عکس فراہم کیے ہیں۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مشاہیر کے سوادِ تحریر کو محفوظ کرنے کے لیے اب تک صرف خطوط کو ذریعہ بنایا گیا ہے۔

ان تمام باتوں کے علاوہ کسی شخص کے خطوط ہی وہ واحد چیز ہیں جس میں وہ دنیا سے اٹھ جانے کے بعد بھی کھاتا پیتا، ہنستا بولتا اور معمولاتِ زندگی انجام دیتا ہمیشہ کے لیے ہمارے درمیان موجود رہتا ہے۔اس کے دوست، احباب، پسند ناپسند، رہن سہن، مشاغل، مصروفیات غرض خطوط میں اس کی پوری زندگی جلوہ گر ہوتی ہے۔خط کا یہی وہ لطف ہے جس سے حظ اٹھاتے ہوئے ڈاکٹر شوکت سبزواری کہتے ہیں:

> ’’غالب مرے ہی کب تھے۔وہ آج بھی زندہ ہیں اور میری ان سے دوستی بھی ہے۔جب جی چاہتا ہے ان کے خط اُٹھا کر پڑھ لیتا ہوں اور ہجر میں وصال کے مزے اُٹھا لیتا ہوں۔‘‘ ۲۰

ایک کامیاب اور معتبر محقق، تحقیق میں بنیادی ماخذ و منابع کی اہمیت اور ضرورت سے اچھی طرح واقف ہوتا ہے۔ کیوں کہ یہی وہ لوازمات ہوتے ہیں جن کی مدد سے محقق اپنی دلیل کو مضبوط بنا کر پیش کرنے اور دوسروں کو قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔بنیادی ماخذات تک رسائی اور ان کا حصول ممکن ہو تو محقق کے بھٹک جانے کا امکان بہت کم ہوتا ہے اور وہ ان ماخذات کی مدد سے کسی حتمی نتیجے پر پہنچ کر اپنی رائے دینے کے قابل ہوتا ہے۔

مکاتیب بنیادی ماخذ کے طور پر بہت اہمیت کے حامل ہیں کیوں کہ مکتوب نگار، مکتوب الیہ سے اپنے تعلق کی نوعیت کے مطابق باتوں باتوں میں بعض ایسے اشارے چھوڑ جاتا ہے جو آنے والے وقتوں میں نہایت کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔اشفاق احمد کی ادبی خدمات پر کام کرنے والا ان کے افسانے ’’گڈریا‘‘ سے کسی طرح بھی صرفِ نظر نہیں کر سکتا اور اس افسانے کے متعلق مزید اور بنیادی معلومات ہمیں محمد طفیل کو لکھے گئے اشفاق احمد کے ۹/نومبر ۱۹۵۳ء کے ایک خط میں ملتی ہیں۔اشفاق احمد نے یہ خط اور افسانہ روم میں بیٹھ کر لکھا۔مزید یہ کہ مذکورہ افسانہ محمد طفیل کے بار بار کے تقاضوں سے لکھا گیا۔آپ لکھتے ہیں:

> ’’جانِ برادر، خط ملا، دل خوش ہو گیا۔الحمدللہ کہ تم مجھ سے ناراض نہیں ہو۔کہانی کے تین جملے لکھ لیے ہیں۔افسانہ اچھا ہو گا یعنی تمھیں مایوسی نہ ہو گی۔عنوان گڈریا ہے۔‘‘ ۲۱

نزاعی معاملات و مسائل میں رائے عامہ کو ہموار کرنے اور ناقدین و محققین کو راہ راست پر لانے کے لیے خطوط سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زیادہ معتبر اور کوئی دستاویز نہیں۔ مثال کے طور پر ۱۹۶۱ء میں ڈاکٹر غلام جیلانی برق مرحوم کی ایک چونکا دینے والی کتاب ''دو قرآن'' سامنے آئی اس کے بعد موصوف نے ۱۹۴۹ء میں ''دو اسلام'' کے نام سے اسی طرح کی ایک اور اختلافی کتاب لکھی، جس میں انھوں نے بعض احادیث پر کڑی تنقید کی، یہ وہ دور تھا جب برق صاحب کے نظریات پوری طرح الحاد کی گرفت میں تھے۔ ''دو اسلام'' کے سامنے آنے پر ڈاکٹر غلام جیلانی برق بہت بدنام ہوئے اور انھیں مذہبی و علمی حلقوں کی طرف سے شدید ردِ عمل کا سامنا کرنا پڑا اور ان کے خلاف بہت کچھ لکھا گیا۔ طعن و تشنیع کے علاوہ ان پر کفر کے فتوے بھی لگائے گئے۔ برق صاحب نے بعد میں اپنے ملحدانہ نظریات سے تائب ہو کر اپنی اصلاح کر لی تھی۔ آپ نے ۱۶/ اپریل ۱۹۷۴ء کو مولانا عبدالرشید ارشد کو ایک خط لکھا جو ان کے مذہبی افکار کی درستی کے بارے میں بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے اور جن نکتہ چیں لوگوں کی ان کے خطوط پر نظر نہیں پڑی اور وہ آج بھی انھیں ملحد اور کافر ہی سمجھتے ہیں؛ انھیں برق صاحب کے خطوط کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

> ''میں شاید آپ کو پہلے خط میں بھی لکھ چکا ہوں کہ ۱۹۵۲ء کے بعد میں نے حدیث کے متعلق اپنا موقف بدل لیا تھا۔ بحمد للہ کہ آج میرے عقائد ہو بہو وہی ہیں، جو اہلِ سنت کے ہیں''۔۲۲

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ متن کی تصحیح و تحقیق کے لیے خطوط سے زیادہ قابلِ اعتبار کوئی چیز نہیں۔

خط کی سب سے بڑی خوبی اس کا اختصار ہے۔ دنیا کا کوئی اور نثر پارہ اتنا مختصر اور ایسا جامع نہیں ہوسکتا۔ افسانہ، ناول یا مضمون میں طوالت کے باوجود بھی کہیں نہ کہیں تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن خط کی یہ صفت ہے کہ مختصر ہوتے ہوئے بھی اپنے اندر ایک جہانِ معنی رکھتا ہے اور جب سے خطوط کی تدوین کرنے والے خطوط کو حواشی اور تعلیقات سے مرصع کرنے لگے ہیں، خط کا ہر لفظ، ہر جملہ بولنے لگا ہے، حتیٰ کہ رموزِ اوقاف اور علامات کو بھی زبان مل گئی ہے۔ مرتب کو اگر خط میں کوئی وضاحت طلب اشارہ، کنایہ یا تحقیق طلب ابہام نظر آتا ہے یا بین السطور کسی مفہوم کی آہٹ محسوس ہوتی ہے تو وہ کھوج لگا کر حالات و واقعات کی کڑیاں ملاتے ہوئے ایک ایک کر کے تمام حجابات سے پردہ اُٹھا دیتا ہے اور اسی میں اس کی کامیابی ہوتی ہے۔ اب مکتوب چند جملوں یا پیراگراف کا مرقع نہیں رہا بلکہ ظاہر و پوشیدہ چونکا دینے والی معلومات کا خزینہ ہے: حقیقت تو یہ ہے کہ:

> ''یہ کاری گری بھی ہے اور آئینہ سازی بھی۔ یہ مختصر اور محدود بھی اور وسیع و بے کراں بھی ہے۔ یہ حد سے زیادہ شخصی بھی ہے مگر اس کے باوجود آفاقی اور اجتماعی بھی۔ اس میں دانش بھی ہے اور بینش بھی۔ یہ بظاہر کچھ بھی نہیں مگر اس کا ہر ورق پھر بھی دفتر ہے معرفت کردگار اور معرفت انسان دونوں کا۔ یہ لکھنے والے کے لیے محض عرضِ سخن ہے مگر پڑھنے والے کے لیے گنجینہ فن بھی ہوسکتا ہے۔''۲۳

عرضِ سخن تو یہ ہے ہی؛ اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ مکتوب نگار جب خط لکھتا ہے تو وہ بعض اوقات شدتِ جذبات کے زیرِ اثر ہو کر یا لاشعوری طور پر اپنے متعلق بعض ایسی باتیں بھی لکھ جاتا ہے جو اُس کی روزمرہ زندگی اور عام معاملات میں بظاہر نظر نہیں آتیں لیکن وہ باتیں اس کے دل کے نہاں خانوں میں موجود ہونے کی وجہ سے اس کی شخصیت کا حصہ ہوتی ہیں، اور وہ کسی دوسرے انسان سے وہ باتیں کرنا چاہتا ہے، لیکن کسی معاشرتی مجبوری، معاشرتی توقعات۔ ذاتی ساکھ، ذاتی وجوہ یا مصلحت کے تحت وہ ان باتوں کو کسی دوسرے پر کھولتا نہیں اور اپنا بھرم قائم رکھنے کے لیے ان پر پردہ ڈالے رکھتا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے۔یوں دیکھا جائے تو مکتوب نویسی، مکتوب نگار کی ذات کا اظہار یہ ہے۔علامہ شبلی نعمانی کا عطیہ فیضی سے عشق کا معاملہ طشت از بام ہوئے عرصہ ہوگیا۔اب تو اردو ادب سے واجبی سا تعلق بھی رکھنے والا ہر شخص اب اس ثقہ اور بہت بڑے عالم کے معاشقے سے واقف ہے لیکن جب پہلی بار یہ خطوط منظرِ عام پر آئے تو لوگ انگشت بہ دنداں ہو گئے کیوں کہ وہ شبلی کو ایک عالم کی حیثیت سے ہی جانتے تھے اور اُن کی اسی حیثیت سے مرعوب تھے۔شبلی کا یہ عشق راز ہی رہتا اگر وہ خطوط شائع نہ ہوتے جو انھوں نے عطیہ کو لکھے تھے؛ ورنہ قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسمیں کھا کر بھی کہتے رہو تو کون یقین کرتا کہ ''ندوۃ العلما'' کی آبرو،شبلی جیسے متین ادیب اور زاہدِ پارسا کہ جو دامن نچوڑ دے تو فرشتے وضو کریں، ''سیرت النبی'' اور ''الفاروق'' کے مصنف کے دل میں بھی کوئی بت کافر چھپا بیٹھا تھا:

''اگر یہ خطوط منظرِ عام پر نہ آتے تو اصلی شبلی ہم سے پوشیدہ ہی رہتے۔ہم صرف اُن کے تقدس کا احترام کرتے''۔[۲۴]

ان خطوط سے علامہ شبلی نعمانی کی زندگی کا ایک اور گوشہ تو ہمارے سامنے آیا ہی ہے اس کے ساتھ ساتھ شیخ محمد اکرام نے ''اردو میں عشقیہ خطوط کے بانی'' [۲۵] کا سہرا بھی انھی کے سر پر سجا دیا ہے۔

مکتوب نگار تو اپنے مکتوب میں ہمہ وقت موجود رہتا ہی ہے؛ بعض اوقات وہ دوسروں کے بارے میں بھی ایسی معلومات اور انکشافات لکھ جاتا ہے جو اس سے پہلے نہ کسی نے سنی ہوتی ہیں اور نہ وہ کسی مصلحت،خوف یا مجبوری کے تحت کسی مضمون یا کتب میں درج کرتا ہے۔''ضربِ کلیم'' میں شامل علامہ اقبال کی ایک نظم ''ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام'' میں جو سید زادہ ان کا مخاطب تھا،اس کا نام انھوں نے ہمیشہ چھپا کر رکھا تھا۔ان کے دوستوں اور دیگر لوگوں نے اس سید زادے کے بارے میں ضرور دریافت کیا ہوگا لیکن جس انداز کا مضمون نظم میں بیان کیا گیا ہے اور جس طریقے سے سید زادے کو مخاطب کیا گیا ہے؛ اس کا تقاضا یہی تھا کہ وہ نام پردۂ اخفا ہی میں رہے۔لیکن مولانا غلام رسول مہر نے اپنے اس خط میں اس راز سے پردہ اُٹھا ہی دیا۔محمد عالم مختار حق کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

سید زادہ ''بخاری'' تھے...جو پطرس کے نام سے مشہور ہوئے۔بخاری مرحوم نے یہ واقعہ خود سالک مرحوم کو سنایا تھا۔انھوں نے یہ ذکر مجھ سے کیا''۔[۲۶]

انسانی ذہن پڑھنے والی مشین ایجاد کرنے کی کوشش کرنے والوں نے شاید کبھی خطوط نہیں پڑھے ورنہ انھیں معلوم ہوتا کہ کاغذ پر بکھرے چند الفاظ سے وہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے جو اظہارِ ذات کے لیے وہ مشین سے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔اگر ایسی مشین ایجاد ہو بھی جائے تو مکتوب کو اس لحاظ سے فوقیت حاصل ہو گی کہ اظہارِ ذات کے ساتھ ساتھ یہ تزکیہ نفس (Catharsis) کا بہترین وسیلہ بھی ہے۔جس کے نتیجے میں قلب و اذہان کو سرور ملتا ہے اور طبیعت میں ٹھہراؤ اور زندگی میں سکون پیدا ہوتا ہے۔اگر ان ناآسودہ خواہشات اور جذبات کو اظہار کا راستہ نہ ملے تو غیر محسوس طریقے سے یہ انسان کی ذہنی صحت پر اثر انداز ہو کر بہت بُرے اثرات مرتب کرتی ہیں اور انسان کی شخصیت کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حصہ بن کر بہت پیچیدہ اور پریشان کُن صورتِ حال پیدا کرتی ہیں۔اس مقام پر خطوط کی اہمیت گفتگو سے زیادہ ہو جاتی ہے۔

یوں تو بے شمار خطوط ایسے ہوں گے جو باطنی خواہشات، زندگی کے مسائل اور منہ زور تمناؤں کے اظہار کے لیے لکھے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گئے ہیں لیکن مولانا ابوالکلام آزاد کے ''غبارِ خاطر'' کے نام سے شائع ہونے والے خطوط اس لیے خاص اہمیت کے حامل ہیں کہ یہ خطوط کبھی بھی حوالہ ڈاک نہیں کیے جا سکے اور نہ ہی یہ اس غرض کے لیے لکھے گئے تھے۔ شاید یہ دنیائے ادب میں اپنی نوعیت کے واحد عجیب و غریب خطوط ہیں جو مکتوب نگار نے اس وقت لکھ تو دیے مگر فوری طور پر انھیں پڑھنے والا کوئی نہیں تھا اور جب لوگوں نے پڑھنا شروع کیا تو اردو ادب میں سب سے زیادہ پڑھے جانے والے خطوط میں شمار ہونے لگے۔ محمد اجمل خاں غبارِ خاطر کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

> ''اس مجموعے میں جس قدر مکتوبات ہیں وہ تمام تر نواب صدر جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی رئیس بھیکم پور ضلع علی گڑھ کے نام لکھے گئے تھے۔ چوں کہ قلعہ احمد نگر کی قید کے زمانے میں دوستوں سے خط و کتابت کی اجازت نہ تھی اور حضرت کی کوئی تحریر باہر نہیں جا سکتی تھی اِس لیے یہ مکاتیب وقتاً فوقتاً لکھے گئے اور ایک فائل میں جمع ہوتے رہے۔'' ۲۷

ڈاکٹر سیّد عبداللہ نے ان مکتوبات کو ایسے خیالیے قرار دیا ہے جن میں زیادہ تر اپنی ہی ذات مرکزِ توجہ بن جاتی ہے۔ جب کہ ڈاکٹر انور سدید نے ان خطوط کے لیے ''خود کلامیے'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ دونوں نظریے ''غبارِ خاطر'' کے خطوط کے مطالعہ کے دوران میں پیدا ہونے والے فوری نتائج کی ایک شکل ہے، جن پر نظرِ ثانی کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی ورنہ حقیقت یہی ہے کہ یہ نہ تو ''خیالیے'' ہیں اور نہ ہی ''خود کلامیے'' بلکہ مولانا کے کتھارسس کا ذریعہ ہیں۔ کتھارسس کے ساتھ ساتھ یہ خطوط ان لوگوں کے لیے مشعلِ راہ ہیں جو تنہائی کی اذیت سے دوچار ہیں اور زندگی کو بہت دشوار خیال کرتے ہیں۔ یہ خطوط بتاتے ہیں کہ اگر انسان کے اندر امنگ اور کچھ کر گزرنے کی خواہش موجود ہو تو وہ تنہائی کو بھی محفل میں تبدیل کر سکتا ہے۔

اسی طرح کا ایک اور عجوبہ جو کتابی صورت میں نمودار ہوا؛ خواجہ عبدالرشید کا سفر نامہ سیرِ فرنگ ہے۔ یہ کوئی باقاعدہ سفر نامہ نہیں ہے بلکہ خواجہ عبدالرشید کے چند خطوط کا مرقع ہے جو انھوں نے عبدالماجد دریابادی کو لکھے تھے جو بعد میں سیرِ فرنگ کے نام سے ایک سفر نامے کی صورت میں شائع ہوئے۔ اس کتاب کے حوالے سے خواجہ عبدالرشید صاحب لکھتے ہیں:

> ''یہ سفر نامہ درحقیقت چند ایک خطوط پر مبنی ہے جو میں نے مختلف ممالک سے جناب عبدالماجد دریابادی مرحوم کی خدمت میں وقتاً فوقتاً روانہ کیے۔ میرا طریقہ یہ تھا کہ میں نے کبھی لوٹ کر ان کو کچھ سفر کے بارے میں نہیں لکھا تھا بلکہ اس وقت جہاں ہوتا اور جو کچھ دیکھا ہوتا اس کو مختصر طور پر خط کی شکل میں لکھ کر روانہ کر دیتا''۔ ۲۸

خطوط سے وابستہ عجائبات کی بات چل نکلی ہے تو آپ کو بتاتا چلوں کہ اپنی نوعیت کا ایک انوکھا واقعہ ''تحریک ریشمی رومال'' ہے۔ انگریز اگرچہ اپنے مکر و فریب اور چالاکی سے برِصغیر پر قابض تو ہو گئے تھے لیکن برِصغیر کے مسلمانوں نے اول روز سے انگریزی حکومت کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ انھوں نے انگریزوں اور ہندوؤں کے تمام مظالم اور سازشوں کا سامنا کیا لیکن ان کے دل ان کی غلامی قبول کرنے کے لیے کبھی بھی تیار نہیں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے لے کر تحریکِ پاکستان تک جتنی بھی مسلمانوں کی تحاریک اُٹھیں ان میں سے بیشتر کا نصب العین انگریزوں سے نجات حاصل کرنا تھا۔ حضرت شیخ الہند محمود حسن اور ان کے چند وفادار اور رازدار ساتھیوں نے بھی اسلام کی ترویج و اشاعت اور مسلمانوں کو انگریزوں سے نجات دلوانے کے لیے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خفیہ تحریک کا آغاز کیا۔ جسے ''تحریک شیخ الہند'' کہا جاتا ہے۔ انگریزوں نے اسے ''ریشمی خطوط سازش کیس'' کا نام دیا اور اب اس کے تحریک ریشمی رومال کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس تحریک کو ''ریشمی رومال'' کا نام اس لیے دیا گیا ہے کہ یہ ریشمی رومال پر لکھے ہوئے چند خطوط تھے۔

''یہ خطوط زرد رنگ کے ریشمی کپڑے کے تین ٹکڑوں پر ہیں... مولوی عبید اللہ نے [یہ] خطوط لکھے تھے''۔۲۹

مکتوب نگاری کی افادیت بین الاقوامی طور میں یکساں مسلّم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مکتوب نگاری کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے انٹرنیشنل لائبریری سکیم،، ڈیوی ڈیسی مل کلاسفیکشن سکیم Dewey Decimal Classification کے تحت Literary Form کی ذیل میں خطوط اور مراسلات کو دوسری اصنافِ سخن مثلاً ناول، ڈرامہ، تنقید، تحقیق، اور تاریخ وغیرہ کے برابر اہمیت دی گئی ہے۔

خطوط کی اہمیت کا اس سے بڑا کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ غالب سے لے کر سر سیّد احمد خاں، ڈپٹی نذیر احمد، اکبرالہ آبادی، ابوالکلام آزاد، سیّد سلیمان ندوی، شبلی نعمانی، رشید احمد صدیقی، مولوی عبدالحق، سیّد ابو اعلیٰ مودودی، قائداعظم محمد علی جناح، علامہ اقبال، فیض احمد فیض جیسی ہر اہم شخصیت کے خطوط کو کتابی صورت میں محفوظ کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ غالب کے دوستوں اور شاگردوں نے ان کی زندگی ہی میں ان کے خطوط کو مرتب کرنے کے خیال سے یک جا کرنا شروع کر دیا تھا۔ رشید احمد صدیقی کے خطوط کو اکٹھا کرنے اور شائع کرنے کے لیے لطیف الزماں خاں نے اپنی زندگی وقف کر دی۔ مظفر حسین برنی نے علامہ اقبال کے مکاتیب کو مرتب کرنے کا گراں قدر کام کیا۔

بعض اصحاب خطوط کی ترتیب و تدوین کو بہت آسان سمجھتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو خود کبھی بھی اس تجربے سے نہیں گزرے لیکن جن لوگوں نے خطوط کی تدوین و ترتیب کا مرحلہ سر کیا، کچھ وہی جانتے ہیں کہ قطرے کو گہر ہونے تک کتنے کٹھن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اوّل تو خطوط کا کھوج لگانا ہی بہت دشوار ہے کیوں کہ جن لوگوں کو خط کی اہمیت کا اندازہ تھا وہ تو اسے سینے سے لگائے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد یہ دولت ان کی اولاد کو منتقل ہو گئی اور اگر شومئی قسمت ان لوگوں کو اس کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں تو وہ ایک واحد کاغذ کو کہاں تک اور کس لیے سنبھال کر رکھیں گے۔ ایسے حالات میں خط کے ضائع یا گم ہونے کے بہت امکانات ہوتے ہیں اور اگر خوش قسمتی سے خطوط کا پتا لگ بھی جائے تو ان کے حصول کے لیے ہزار جتن کرنا پڑتے ہیں۔ غالب کے خطوط مرتب کرتے وقت خطوط کے حصول کے لیے خود غالب کو جو الجھنیں پیش آئیں ان کا ذکر خطوطِ غالب میں آتا ہے حالانکہ اس وقت غالب زندہ تھے اور مکتوب الیہ میں سے اکثر ان کے دوست آشنا تھے لیکن اس کے باوجود خطوط فراہم کرنے والے بعض حضرات لیت و لعل سے کام لیتے رہے۔ مدیر نقوش محمد طفیل نے مکاتیب نمبر شائع کرنے کی ٹھانی۔ اس کے لیے انھیں بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لوگوں کی منتیں کیں، ان کے پیچھے مارے مارے پھرتے رہے۔ یہاں تک کہ چوری جیسا جرم بھی کرنا پڑا۔ اپنی مشکلات کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ اعترافِ جرم بھی کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''میں نے ان خطوں کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ شہر شہر گھوما، گھر گھر صدا دی۔ کسی نے میرے شوق کو سینے سے لگایا۔ کسی نے بات بھی نہ پوچھی۔ یوں امید و بیم کے دوراہے پر چلتا چلتا نیم جان ہو گیا، مگر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جنون میں کمی نہ آئی۔ بچپنے میں چوری کی ہو تو کی ہو، اس عمر میں تو نہیں کی تھی۔ مگر اس کم بخت شوق میں یہ کام بھی کیا۔'' ۳۰

مکتوبات کے حصول کے لیے اسی طرح کی مشکلات کا اظہار ڈاکٹر شمس المصباحی نے بھی کیا ہے:

سر میں مجنوں کا جنوں تھا اور ہاتھ میں تیشہ فرہاد۔ فصیلیں توڑ دیں، کھنڈرات کھودے؛ جہاں خط کا سراغ ملا، وہاں کے خزانے کھنگال ڈالے، دفینے اُلٹ پلٹ کے دیکھا؛ اخبارات وجرائد کی بوسیدہ فائلوں کی گرد جھاڑی۔ اس جنوں خیزی اور صحرا پیمائی سے حاصل یہ ہوا کہ امام احمد رضا کے کئی درجن قلمی خطوط تحویل میں آ گئے۔ ۳۱

سید مرتضٰی حسین فاضل اردوئے معلےٰ کو مرتب کرنے کی مشکلات کا ذکر یوں کرتے ہیں:

مجھے ۱۳ فروری ۱۹۴۶ء کو لکھنؤ کے مشہور بازار ''نخاس'' سے اردوئے معلےٰ کا پہلا ایڈیشن ملا تو میں نے دورانِ مطالعہ سب نسخوں کو سامنے رکھ لیا اور نیت کی کہ ایک جامع نسخہ تیار کروں گا۔ جو نیا خط کسی رسالے سے ملا نقل کر لیا۔ لکھنؤ یونیورسٹی اور جناب مخدومی پروفیسر مسعود حسن صاحب کے کتب خانوں اور پرانے رسالوں کا مطالعہ کیا، گلی گلی کی خاک چھانی اور اچھی خاصی چیزیں جمع کر لیں۔۔۔ خوش نصیبی سے ۴؍ اگست ۱۹۶۵ء کو جناب سید امتیاز علی صاحب تاج مدظلہم نے حکم دیا کہ عودِ ہندی کے انداز پر اردوئے معلےٰ بھی مرتب کروں، تو خیال ہوا کہ یہ کام سال بھر میں مکمل ہو جائے گا مگر چار پانچ سال کی مسلسل محنت کے بعد آج یہ سطریں لکھنے بیٹھا ہوں''۔ ۳۲

مندرجہ بالا مشاہیر نے صرف خطوط کے حصول کے لیے انھیں جو مشکلات پیش آئیں، درج کی ہیں؛ لیکن اب تو صرف خطوط کی تدوین واشاعت ہی کو کافی نہیں سمجھا جاتا، حواشی بھی لکھنا ہوتے ہیں اور اگر حواشی وتعلیقات کا تعلق کسی ایسے شخص کے متعلق ہو جو گم نام ہو یا اس کی شہرت علاقائی سطح تک محدود ہو، یا ایسی کتاب کے بارے میں ہو جو نایاب ہو یا مقامی شہرت رکھتی ہو، تو ایسی حالت میں حواشی وتعلیقات کا حصول بڑا اذیت ناک ہوتا ہے؛ چنانچہ حواشی وتعلیقات کے مصائب اس کے علاوہ ہیں۔

مکتوب نگاری اور اس کی تدوین وترتیب صرف اردو زبان وادب کا ہی خاصہ نہیں بلکہ دنیا کے ہر ملک میں شعبۂ ادبیات سے متعلق لوگوں میں یہ روایت موجود ہے۔ انگریزی ادب میں ولیم کوپر، تھامس گرے، لیڈی میری مانگو، میری کلیورنگ، لارڈ ہیروے، رابرٹ والپول، فلپ ڈور، چارلس لیمپ، شیلے، بائرن، لارنس اور کیٹس کے خطوط کی مثالیں موجود ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ شہرت کیٹس کے اُن محبت بھرے خطوط کی ہوئی جو اس نے اپنی محبوبہ فینی بران کو لکھے تھے۔ ان خطوط میں جذبے کی ایسی شدید لہر ہے جو پڑھنے والے کو بھی اپنے ساتھ بہالے جاتی ہے اور محبت کے منکر کا بھی محبت کرنے کو دل کرتا ہے۔ کیٹس فینی بران کو لکھتا ہے:

My dearest girl,

I must write you a line or two and see if that will assist in

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

dismissing you from my mind for ever so short a time...i can not exist with you.I am forgetful of every thing but seeing you again my life stop there.I see no further.You have absorbd me.I have a sensation at the present moment as though i was dissolving.I should be exquisitely miserable without the hope of soon seeing you.I should be afraid to separate myself far from you...I cannot be happier away from you...I have been astonished that men could die martyrs for religion.I have shudderd at it...I could be martyre for my religion.Love is my religion .I could die for that.I could die for you.My greed is love and you are its onlytent... I cannot breathe without you ۳۳

نقوش کے مدیر محمد طفیل کے بیٹے جاوید طفیل کے پاس مشاہیر کے خطوط کا ایک ذخیرہ موجود تھا۔ یہ ذخیرۂ مکاتیب اُن مشاہیر کے خطوط پر مشتمل تھا جو اس عہد کے نام ور شعرا اور ادبا نے محمد طفیل مدیر نقوش کو لکھے تھے۔ محمد طفیل نے اس متاع کی قدر و قیمت جانتے ہوئے اسے ہمیشہ سینے سے لگا کر رکھا اور ۱۹۶۵ء کی پاک، بھارت جنگ میں اپنے گھر والوں کو بھی سب سے زیادہ اس پوٹلی کی حفاظت کی تاکید کی؛ جس میں یہ اثاثہ بندھا پڑا تھا۔ یہ خطوط نہ صرف ادب اور اس سے متعلقہ معاملات کے کئی گوشے منور کرتے ہیں بلکہ یہ نقوش کے کام یاب سفر کی روداد بھی ہیں۔ اِن خطوط سے محمد طفیل کی اس محنت کا سراغ ملتا ہے جو انھوں نے اس رسالے کے لیے کی۔ آپ نے اچھے ادب کے حصول کے لیے اپنے عہد کے نام ور ادیبوں کو بار بار خط لکھے۔ یہ خطوط اس افسوس ناک المیے کی بھی نشان دہی کرتے ہیں کہ نقوش کی بندش کسی مالی خسارے کی وجہ سے نہیں بلکہ معیاری ادب کے فقدان کی وجہ سے ہوئی:

> ''اس اثاثے کے بہت سے امیدوار تھے۔ فرنچ میوزیم پیرس نے ایک خطیر رقم جو کروڑوں میں بنتی ہے، کے عوض یہ چاہا کہ یہ سب کچھ ان کو دے دیا جائے۔'' ۳۴

یہ الگ بات کہ جاوید طفیل نے محبِ وطن پاکستانی اور لائق فرزند ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے مال و منال سے بھرپور یہ پیش کش ٹھکرا کر یہ علمی خزانہ بلا معاوضہ گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی لاہور کے سپرد کر دیا۔ فرنچ میوزیم پیرس کی دل چسپی اور کروڑوں روپے کی پیش کش سے نہ صرف ان خطوط کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ مجموعی طور پر خطوط کی قدر و قیمت واضح ہوتی ہے۔

نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، قربانی، جسمانی اعضا کی پیوند کاری، طلاق، تجارت اور دیگر شرعی و دینی مسائل کی توضیح و تشریح میں مکتوب نگاری کی روایت کا معتدبہ حصہ ہے۔ دور دراز کے علاقوں میں بسنے والے لوگ خطوط کے ذریعے اپنی الجھنوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اورحل طلب مسائل اور جواب طلب امور کے متعلق دریافت کر لیتے ہیں۔ برِصغیر پاک و ہند میں ہر قابلِ ذکر اسلامی ادارے نے اس مقصد کے لیے ایک الگ شعبہ ''دارالفتاوی'' قائم کر رکھا ہے۔ جس کا بنیادی مقصد ہی آنے والے خطوط کو پڑھنا اور اُن کے جوابات دینا ہے۔ مولانا یوسف لدھیانوی کی کتاب آپ کے مسائل اور ان کا حل جو بارہ جلدوں پر مشتمل ہے، ایسے ہی خطوط کا مرقع ہے جو انھیں لوگوں نے اپنے مسائل کے حوالے سے لکھے تھے۔

حضرت پیر مہر علی شاہ کی [کذا۔ کے] مکتوبات طیبات زیادہ تر ان کے فتاوی پر مشتمل ہے [کذا۔ ہیں] جو لوگوں کے استفسار پر لکھے گئے۔ اسی کتاب میں کانگرس میں مسلمانوں کی شمولیت کے بارے میں ان کا یہ معرکے کا فتوی بھی خط کی شکل میں موجود ہے:

''میری رائے میں یہ شمولیت اسلام کے برخلاف اور ناجائز ہے۔''۳۵

مذہبی اکابرین کے خطوط کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ ہمارے مذہبی اکابرین؛ چاہے اُن کا تعلق کسی بھی مکتبہ فکر سے ہو؛ انھیں اپنی بات پھیلا کر اور زور دے کر بیان کرنے کی عادت ہوتی ہے؛ اس لیے ان کے خطوط میں بھی عام طور پر یہ طوالت اور مناظرانہ لب و لہجہ حاوی ہوتا ہے۔ زیادہ تر علما کے اکثر خطوط دو دو صفحات یا اس سے بھی زیادہ پر پھیلے ہوتے ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی کا ایک خط ایسا بھی ہے جو چالیس صفحات پر محیط ہے۔ غالب نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا تھا؛ علمائے کرام نے اسے مضمون کی شکل دے دی۔ مناظرانہ مکتوب نگاری کی ایک انوکھی مثال ''المراجعات'' ہے۔ یہ کتاب دو متضاد مکاتبِ فکر کے علما شیخ سلیم البشری اور سید عبدالحسین شرف الدین کے مابین خطوط پر مبنی ہے۔ اس کتاب کا انداز مکالماتی ہے۔ اس میں دونوں علما اپنے مکاتبِ فکر کے دفاع کے علاوہ ایک دوسرے پر نازک معاملات کے متعلق سوال بھی کرتے ہیں؛ لیکن سوال کرنے اور جواب دینے کا انداز ایسا دل نشیں اور دل پذیر ہے کہ دل کے شیشے میں بال تک نہیں آتا۔ مکالماتی انداز کی جو دوسری کتاب میری نظر سے گزری اس کا نام کہانی اور یوسا کا معاملہ ہے۔ یہ محمد حمید شاہد اور عمر میمن کی مراسلت کا مرقع ہے۔ اس کتاب میں جدید افسانے کے فن، خدوخال، ساخت اور تکنیک پر بہت وقیع مواد موجود ہے۔ ہر خط ایک مضمون کی صورت میں ہے؛ اور ہر خط میں کسی نئے زاویے سے افسانے کی تشریح و توضیح کی جا رہی ہے۔ افسانے سے دل چسپی رکھنے والوں کو اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔ جب یہ خطوط لکھے جا رہے تھے تو عمر میمن ان کی افادیت سے پوری طرح آگاہ تھے؛ اسی لیے انھوں نے حمید شاہد کو اس مکالمے کی اشاعت کا مشورہ دیا۔ لکھتے ہیں:

''میں جب آپ کے تازہ خط پڑھ رہا تھا تو اچانک مجھے خیال آیا؛ آپ نے یوسا کے ہر خط کے حوالے سے مجھے ایک خط لکھا ہے۔ ان خطوں کی اپنی ایک حیثیت ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ان پر نظرِ ثانی کر کے انھیں سلسلے وار یا کتابی شکل میں چھپوا دیا جائے۔ ان کا لہجہ بے حد شگفتہ اور علم رسا ہے۔'' (۳۶)

[۲]

مکتوب نگاری عہدِ جدید کی پیداوار نہیں بلکہ یہ روایت اس قدیم ترین خط سے جڑی ہوئی ہے جس کا سراغ قرآن مجید میں ملتا ہے جو حضرت سلیمان علیہ السلام نے شہرِ سبا کی ملکہ بلقیس کو لکھا تھا:

اِذهَب بِّكِتٰبِي هٰذَا فَاَلقِهُ اِلَيهِم ثُمَّ تَوَلَّ عَنهُم فَانظُر مَا ذَا يَرجِعُونَ۔ قَالَت يٰٓاَ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

يُّهَاالْمَلَؤُااِنِّيْٓ اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ۔

ترجمہ: میرا یہ خط لے جا کر اُن پر ڈال پھر ان سے الگ ہٹ کر دیکھ کہ وہ کیا جواب دیتے ہیں۔ وہ عورت بولی اے سردار بے شک میری طرف ایک عزت والا خط ڈالا گیا۔'' ۳۷؎

قرآن مجید کے علاوہ انجیل میں بھی بہت سے خطوط ملتے ہیں:

''پولس رسول روم کی کلیسا سے ملاقات کا ارادہ رکھتا اور تیاری کر رہا تھا۔ اُس نے یہ خط اُس ملاقات کی راہ تیار کرنے کی غرض سے لکھا۔ اُس کا منصوبہ یہ تھا کہ کچھ عرصہ وہاں کے مسیحوں کے درمیان کام کرے اور پھر اُن کی مدد سے ہسپانیہ چلا جائے۔ اس خط میں وہ بیان کرتا ہے کہ میں مسیحی ایمان کو کیا سمجھتا ہوں اور مسیحوں کی زندگیوں کے لیے ان کے عملی مضمرات کیا ہیں''۔ ۳۸؎

قرآن اور انجیل میں موجود ان خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ مکتوب نگاری کی روایت بہت قدیم ہے، اگرچہ اس دوران میں خطوط نویسی نے کئی روپ بدلے لیکن یہ روایت کسی نہ کسی صورت میں بہر حال موجود رہی لیکن اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا یہ جدید سائنسی دور اس قدیم روایت کا آخری سرا ہے۔ فیکس، ٹیلی پرنٹر، ای میل، ٹیلی فون، اور موبائل جیسے جدید آلات کی ایجاد نے خطوط نویسی کا گلا گھونٹ دیا۔ یہ اور بات کہ ان آلات کی ایجاد بھی خط ہی کی مرہونِ منت ہے۔ اگر خطوط نویسی کی روایت اس کے پیچھے نہ ہوتی تو شاید ذہنِ انسانی کا ان حیرت انگیز ایجادات کی طرف خیال بھی نہ جاتا کیوں کہ بنیادی طور پر یہ بھی خط کی طرح پیغام رسانی کے ذرائع ہیں۔ لیکن خط اپنی منزل پر پہنچتے پہنچتے دیر لگا دیتا ہے جب کہ ان آلات سے پیغام کی فوری ترسیل ہو جاتی ہے۔ اپنی اسی خوبی کی بدولت ان ایجادات نے مکتوب نگاری کو قصۂ پارینہ بنا دیا ہے۔ ایسے حالات میں مشاہیر کے بچے کھچے خطوط کا تحفظ اور اشاعت اور بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ اسی حوالے سے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کہتے ہیں:

''خطوط نویسی کی روایت ہی دم توڑ رہی ہے۔ جو کہنا سننا ہو وہ ای۔ میل، کمپیوٹر اور ٹیلی فون پر کہہ سن لیا جاتا ہے۔ ایسے میں ضروری معلوم ہوا کہ بزرگوں کے لکھے ہوئے جو خطوط بچ رہے ہیں ان میں سے سب نہیں تو کم از کم مشاہیر ادب کے خطوط کو کتابی شکل میں محفوظ کر لیا جائے تاکہ آنے والی نسلیں بھی حسبِ توفیق ان سے مستفید ہو سکیں۔'' ۳۹؎

حضور ﷺ کے عہد میں مکتوب مکمل اور با اعتماد پیغام رسانی کا سب سے بڑا اور واحد ذریعہ تھے۔ اس لیے آپ نے بھی اس ذریعے کو خوب استعمال کیا اور دین کی تبلیغ کے لیے ہمسایہ حکمرانوں اور عرب کے قبائلی سرداروں کو خط لکھے۔ جنھیں صحابہ کرام محفوظ کرتے رہے۔ صحابہ کرامؓ میں مکتوباتِ نبوی کو سب سے پہلے حضرت عمر بن حزم انصاریؓ نے جمع کیا تھا، یہ مجموعہ ۲۱ مکتوباتِ گرامی پر مشتمل تھا۔ آپ ﷺ کے خطوط میں ذہنی وفکری انقلاب کا پورا پورا سامان موجود ہے۔ چوں کہ آپ ﷺ کسی ایک قوم، ملک یا خطے کے نبی نہیں تھے بلکہ آپ تمام بنی نوع انسان کے رسول تھے اس لیے آپ ﷺ نے اپنے مکتوبات کے ذریعے دور دراز کے رہنے والے ان لوگوں جو حاضری کے شرف سے محروم رہے، کے سامنے بھی بڑے مؤثر طریقے سے اسلام کی صحیح صورت پیش کی۔ آپ ﷺ نے تمدن اور معاشرت کے تمام اخلاقی اور سنہری اصول اپنے خطوط میں رقم فرمائے۔ اختصار، سادگی اور دردمندی ان خطوط کی نمایاں خوبی ہے اس کے علاوہ استرداد کا ایک دل نشیں اور لطیف انداز بھی ہے جو ہمارے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عہد کے ان لوگوں کی رہنمائی کرتا ہے جو اسلام کو دوسرے مذاہب کے لوگوں کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں:

''ان کا اندازِ بیان از دل خیزد، بر دل ریزد کی آپ اپنی مثال ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ زمانے کے انقلابات اور لیل و نہار کی ہزاروں گردشوں کے باوجود ان میں آج بھی وہی نورِ ہدایت اپنی پوری تابناکی اور رعنائی کے ساتھ جلوہ آرا ہے جس نے چودہ سو سال پہلے دنیا میں ایک انقلاب برپا کیا تھا۔''[۹]

حضرت علیؑ کا دورِ خلافت اضطراب و انتشار اور آزمائش کا دور تھا۔ خلافت کے پہلے دن سے ہی آپ بری طرح اندرونی مسائل میں گھر گئے۔ آپؑ کا سارا دورِ خلافت داخلی انتشار اور خلفشار کی اصلاح کی کوشش میں صرف ہوا، جس کی وجہ سے بیرونی دنیا کی طرف آپ توجہ نہ دے سکے اور فتوحات کا سلسلہ برقرار نہ رہ سکا۔ ظہورِ اسلام کے بعد پہلی بار مسلمان کی تلوار مسلمان کے خلاف اُٹھ رہی تھی۔ جناب علیؑ نے اپنی حکمت اور دانائی سے ان حالات کو سازگار اور پرسکون بنانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن مفسدوں کی شرارتوں اور باغیوں کی تخریبی کارروائیوں کی وجہ سے آپ کو کامیابی نہ ہوئی اور خلافت کے حالات روز بہ روز سنگین ہوتے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے خطوط میں مسلمانوں کے لیے اخلاص اور اصلاحِ احوال کا تذکرہ بہت ہے۔ آپ نے مسلمانوں کے دو گروہوں میں بڑھتی ہوئی خلیج کو پُر کرنے کے لیے خطوط نویسی کو استعمال کیا اور حضرت امیر معاویہ کو کئی خط لکھے۔ ایک خط میں یوں مخاطب کرتے ہیں:

''تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ بعد میں تم اور ہم اس جنگ کی اس انتہا میں مبتلا رہیں گے، جس تک یہ جنگ ابھی نہیں پہنچی۔''[۱۰]

''انشائے بے خبر'' میں منشی غلام غوث بے خبر اور ''خیر خواہ ہند'' میں ماسٹر رام چندر کا مکتوب نگاری کا انداز اگرچہ اپنے عہد کی روایت سے ہٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے لیکن مراسلے کو مکالمہ بنانے کے علاوہ بے تکلفی اور خط کو صحیح معنوں میں آدھی ملاقات بنانے کی وجہ سے ناقدین غالب کو جدید مکتوب نگاری کا نقطۂ آغاز قرار دیتے ہیں۔ غالب کو اردو ادب کے ان چند ادبا اور شعرا میں امتیازی حیثیت حاصل ہے جو غزل کے علاوہ نثر کا بھی ایک معتبر حوالہ ہیں۔ ان کے نثری سرمائے میں خطوط نگاری کی بڑی اہمیت ہے۔ ادبِ عالیہ کا سرمایہ ہونے کی وجہ سے خطوطِ غالب کے بہت سے مجموعے مرتب ہو چکے ہیں، جن میں عودِ ہندی ان کی زندگی [۱۸۶۸ء] میں شائع ہوا، اردوئے معلیٰ ان کی وفات کے بعد ۱۸۶۹ء میں شائع کیا گیا، مکاتیب غالب کو امتیاز علی عرشی نے ۱۹۳۷ء میں مرتب کیا، خطوطِ غالب کو ۱۹۵۱ء میں غلام رسول مہر نے ترتیب دیا۔

اردو ادب میں مکتوب نگاری کی ادبی حیثیت خطوطِ غالب کی منت پذیر ہے کیوں کہ یہیں سے اردو نثر خصوصاً مکتوب نگاری کے نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس سے پہلے خطوط میں جو زبان استعمال کی جاتی تھی فارسی مکتوب نگاری کے زیرِ اثر وہ ایسی گنجلک، مغلق اور تصنع سے بھرپور ہوتی تھی کہ مفاہیم اس کے بوجھ تلے کہیں دب رہ جاتے تھے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اُس وقت خط لکھنے کا مقصد محض نمائشِ علمیت ہی ہوتا تھا۔ یعنی بات سمجھ آئے نہ آئے لیکن علمیت کا دبدبہ قائم رہے۔ غیر ضروری لمبے چوڑے تین سطری القاب، بھدے اور طویل سرنامے، پیچ دار گفتگو، مقفٰی و مسجع جملے، بے جا تصنع اور تکلف اُس وقت کی عام تحریر اور مکتوب نگاری کی ضرورت اور روایت بن چکے تھے، اور اسی کو ہی سند مانا جاتا تھا۔ مثلاً:

''عرض داشت کم ترین دعا گویان ہمیچمیکمی ابوالفضل مبارک آن کہ ظاہراً و حقیقتاً و مجازاً بدعا گوی ازدیاد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دولت وعمر حضرت شہزادہ کامگار نام دار استوار عالم مدار گردوں اقتدار در دریای فتوت و مروت گوہر تاج دولت وحشمت نو بادۂ بوستان شان وشوکت وعزت نور دیدۂ جاہ جلال نور حدیقہ فضل وکمال مہر سپہر نامداری قطب فلک کام گاری مرکز دائرۂ اقبال''۔۴۲

فارسی کی پیروی میں اردو مکتوب نگاری میں بھی اس بے جان اور مصنوعی روایت کی ایک جھلک مولوی غلام امام شہید کے اس خط میں دیکھی جا سکتی ہے:

''مجموعہ انشائے شیریں زبانی، دیباچہ کتاب سخن معانی زاد حشمتہ، قلم بعد تشریح مراتب اشتیاق وآرزو مندی کے تعزیت کے مضمون سے آنسو بھی بہاتا ہے اور خوشی میں آ کر مبارک باد کا مضمون بھی زبان پر لاتا ہے، زمانے کے خوشی وغم دونوں کا چولی اور دامن کا ساتھ ہے اور دنیا میں دھوپ چھاؤں کی طرح شادی کے ہاتھ میں ماتم کا ہاتھ ہے۔''۴۳

حیرت ہوتی ہے کہ میر تقی میر جیسا شاعر کہ جس کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی ہی سلاست اور روانی ہے اور جس کے اشعار نثر کے بہت قریب ہیں، نے مکتوب نگاری کی اس جامد روایت کو توڑنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ یہ اعزاز بھی مرزا اسد اللہ خاں غالب جیسے مشکل پسند شاعر کے حصے میں آیا کہ اس نے مروجہ روایت سے اعلانِ بغاوت کرتے ہوئے خطوط نویسی کی مروجہ مشکلات کو دور کرنے کی کامیاب سعی کی اور بوجھل اور غیر فطری اردو مکتوب نگاری کو ایک نیا اور آسان روپ دیا اور جس کام (یعنی مرصع، مقفیٰ اور مسجع نگاری کی بجائے سادہ اور سلاست سے بھرپور نثر) کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے انگریزوں نے فورٹ ولیم کالج جیسے بڑے ادارے کی بنیاد رکھی، مرزا غالب نے اپنے خطوط سے وہ کام کر دکھایا۔ مرزا غالب نے اپنے مکتوبات میں عام فہم انداز میں اپنے نجی معاملات، دیگر متنوع موضوعات کے علاوہ اپنی عیش کوشی، شراب نوشی، پنشن کا حصول اور درپیش مشکلات، اپنی ازدواجی زندگی کی جھلک، ڈومنی سے محبت، خوش پوشی، کوتوال سے عداوت، فنی ولسانی مسائل غرض اپنی زندگی اور آس پاس کے ماحول کے تمام پہلوؤں کو قلم بند کیا۔ اس کے علاوہ غالب اپنے عہد کے تغیر پذیر حالات کا عینی شاہد ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی اور اس کے بعد کے بدترین حالات کو غالب نے دہلی میں موجود ہونے کے سبب بڑے قریب سے دیکھا۔ اور پھر اپنے خطوط میں انھیں لکھ کر ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔ میر مہدی مجروح کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''بھائی کیا پوچھتے ہو، کیا لکھوں؟ دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر ہے۔ قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع بازار مسجد جامع کا،، ہر ہفتہ سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا، یہ پانچوں باتیں اب نہیں، پھر کہو دلی کہاں۔۔۔ اہلِ اسلام میں صرف تین آدمی باقی ہیں میرٹھ میں مصطفیٰ خاں، سلطان جی میں مولوی صدرالدین خاں، بلی ماروں میں سگِ دنیا موسوم بہ اسد۔ تینوں مردود مطرود ومحروم ومغموم۔۔۔ تم آتے ہو چلے آؤ، جاں نثار خاں کے چھتے کی، سڑک خان چند کے کوچہ کی سڑک دیکھ جاؤ، بلاقی بیگم کے کوچہ کا ڈھنا، جامع مسجد کے گرد ستر ستر گز گول میدان نکلنا سن جاؤ۔ غالبِ افسردہ دل کو دیکھ جاؤ، چلے جاؤ۔''۴۴

میر مہدی مجروح ہی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

''مصیبتِ عظیم یہ ہے کہ کنواں بند ہو گیا۔۔۔ پرسوں میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا۔ مسجد جامع ہوتا ہوا راج گھاٹ دروازے کو چلا۔ مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازے تک بے مبالغہ ایک صحرا لق و دق۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں وہ اگر اُٹھ جائیں تو ہُو کا مکاں ہو جائے۔۔۔صاحب رام کا باغ، حویلی، ان میں سے کسی کا پتا نہیں ملتا۔ قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا، اب جو کنویں جاتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہو گیا تو یہ صحرا، صحرائے کربلا ہو جائے گا۔۔۔دلی کہاں؟ واللہ اب شہر نہیں ہے کنپ [کیمپ] ہے، چھاؤنی ہے۔ نہ قلعہ، نہ شہر، نہ بازار، نہ نہر۔''۴۵

۱۸/ جون ۱۸۶۱ء کو حکیم سیّد محمد حسن صاحب کو لکھے گئے ایک خط میں اجڑے ہوئے شہر کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں:

''خداوندِ نعمت! کیا تم دلی کو آباد اور قلعہ کو معمور اور سلطنت کو بدستور سمجھتے ہو؟ جو حضرت شیخ کا کلام اور صاحب زادہ شاہ قطب الدین ابنِ مولانا فخر الدین علیہ الرحمۃ کا حال پوچھتے ہو؟ آں دفتر را گاؤ خوردو گاؤ را قصاب بردو قصاب درراہ مُرد۔ بادشاہ کے دم تک یہ باتیں تھیں؛ خود میاں کالے صاحب مغفور کا گھر اِس طرح تباہ ہوا کہ جیسے جھاڑو پھیر دی۔ کاغذ کا پرزہ، سونے کا تار، پشمینہ کا بال باقی نہ رہا۔ شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی رحمۃ اللہ علیہ کا مقبرہ اُجڑ گیا۔ مقبرہ کیا، ایک اچھے گاؤں کی آبادی، اُن کی ادلاد کے لوگ تمام اس موضع میں سکونت پذیر تھے۔ اب ایک جنگل ہے اور میدان میں قبر، اس کے سوا کچھ نہیں۔ وہاں کے لوگ اگر گولی سے بچے ہوں، تو خدا ہی جانتا ہے کہ کہاں ہیں۔''۴۶

غالب کے خطوط کے مندرجہ ذیل مجموعے شائع ہو چکے ہیں:

مکاتیبِ غالب

نادراتِ غالب

نادر خطوطِ غالب، رسا ہمدانی، کاشانہ ادب، لکھنو، ۱۹۳۹ء۔

عودِ ہندی، سید مرتضیٰ حسین فاضل مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۷ء۔

اردوئے معلیٰ: (اول، دوم، سوم) سیّد مرتضیٰ حسین فاضل مجلس ترقیِ ادب، لاہور، ۱۹۶۹ء۔

خطوطِ غالب، غلام رسول مہر، مجلس یادگارِ غالب، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور، ۱۹۶۹ء۔

غالب اور صفیر بلگرامی، مرتب: مشفق خواجہ، عصری مطبوعات، کراچی، ۱۹۸۱ء۔

غالب اور غمگین کے فارسی مکتوبات، مترجم و مرتب: پرتو روہیلہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع اول ۲۰۱۲ء

خطوطِ غالب میں اس عہد کے حالات و واقعات کے علاوہ غالب کی اپنی زندگی بھی بکھری ہوئی صورت میں ملتی ہے۔ مولانا غلام رسول مہر نے انھی خطوط کی مدد سے غالب کی زندگی کے منتشر لمحات کو یک جا کر کے سوانح عمری غالب مرتب کی ہے۔ مراسلے کا مکالمہ بن جانے کے علاوہ ناول کا خلیہ اور انشائیے کی وہ ابتدائی صورت بھی ان خطوط سے جھانکتی ہوئی ملتی ہے جن کی تلاش میں اہل علم، انگریزی ادب کی خاک چھانتے پھرتے ہیں۔

سر سیّد احمد خاں کی ساری زندگی ستم رسیدہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود میں گزری۔ آپ نے علمی احیا کی کوشش کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور مسلمانوں کی زندگی پر چھایا ہوا مُہلک جمود توڑا۔ان کے پیشِ نظر ہر حال میں قوم کی اصلاح اور علمی ترقی تھی کیوں کہ وہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کا شمار مہذب قوموں میں ہو۔اس مقصد کے حصول کے لیے سرسید نے تہذیب الاخلاق اور تحریک علی گڑھ کا آغاز کیا۔اس رسالے اور تحریک علی گڑھ کا آغاز برِصغیر کے مسلمانوں کی ہندوؤں اور انگریزوں سے آزادی اور نشاۃ ثانیہ کا نقطہ آغاز ہے۔آپ نے مسلمانوں اور انگریزوں کے مابین فاصلوں کو کم کرنے کی کوشش کی،جس کی وجہ سے ان کی نیت پر شک کر کے انھیں انگریزوں کا ایجنٹ کہا گیا اور یہ سب کچھ کرنے والے کوئی غیر نہیں بلکہ اپنے مسلمان بھائی تھے۔ان پر کفر کے فتوے لگے،لیکن آپ کی جستجو میں کوئی کمی نہ آئی۔آپ نے تحریک علی گڑھ کے پلیٹ فارم سے مسلمانوں کے لیے پُرخلوص خدمات سرانجام دیں۔آپ نے اپنی تحریک موثر اور زیادہ فعال بنانے کے لیے خطوط بھی لکھے؛آپ کے ان خطوط سے بھی مسلمانوں کے لیے اخلاص اور ہمدردی کا اندازہ ہوتا ہے۔ساتھ ساتھ انھیں یہ سفر طے کرنے میں جو دشواریاں پیش آئیں، ان کی صحیح تصویر بھی انھی خطوط سے مکمل ہوتی ہے۔ان خطوط کے بغیر سرسید کی زندگی،اُس وقت کے حالات اور علی گڑھ تحریک کی تاریخ نامکمل اور بے اعتبار ہوگی کیونکہ انھی خطوط سے سرسید کی کامیابیوں،دشواریوں اور تحریک کو پروان چڑھانے والے عوامل کی نشان دہی ہوتی ہے اور خطوط کے علاوہ ان کی تفصیل کہیں اور درج نہیں۔مسٹر جارج پامر،جسٹس ڈگلس اسٹریٹ،پروفیسر گارسین دتاسی کے تعریفی خطوط کے ساتھ ساتھ ایسے خطوط بھی لکھے گئے جن میں سرسیّد کو قتل کرنے کی دھمکیاں دی گئیں۔ایسا ہی ایک خط ملاحظہ ہو:

> ''ہم نے قرآن کریم پر ہاتھ رکھ کر اور خدا کی قسم کھا کر اس بات کا حتمی اور پختہ ارادہ کر لیا ہے کہ ضرور ضرور بہت جلد ہم تم کو مار ڈالیں گے تاکہ دنیا تمھارے فتنہ سے پاک ہو۔اب تم ہمارے مضبوط ہاتھوں سے نہیں بچ سکتے۔'' ۴۷

علامہ اقبال کی شاعرانہ عظمت سے کسی کو انکار نہیں اور ان کی بین الاقوامی شہرت بھی بطور فلسفی شاعر کی ہے۔ان کی شاعری میں وہ ولولہ اور طاقت پوری شدت سے موجود ہے جس سے قوموں کی تقدیر بدل دینے کا سامان مہیا ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کسی ایک خطے یا علاقے کے شاعری نہیں،بلکہ آفاقی ہے۔ان کے کلام کی آفاقیت کی وجہ سے دنیا کی ہر قابلِ ذکر زبان میں اُن کی شعری مجموعوں کے تراجم ہوئے۔اردو اور فارسی کلام کی شرحیں لکھی گئیں۔لیکن اس کے باوجود اُن کے خطوط،اُن کی شاعری کو سمجھنے کے لیے اِن سب سے زیادہ مدد فراہم کرتے ہیں۔بقول ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی:

> ''(اقبال) کے مکاتیب مستقل اور باقاعدہ تصنیف کی حیثیت نہیں رکھتے لیکن وہ ان کے خیالات اور فلسفہ و افکار کے اظہار اور شرح،وضاحت میں ان کی شعری اور نثری تصانیف سے کم اہم نہیں اور اس اعتبار سے تو مکاتیب کی اہمیت مستقل تصانیف سے بھی بڑھ جاتی ہے۔'' ۴۸

اس وقت تک اقبال کے مکاتیب کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں،جن میں چند ایک حسب ذیل ہیں۔

۱۔ شاد اقبال: مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور،۱۹۴۲ء۔

۲۔ اقبال نامہ: حصہ اول،مرتبہ،شیخ عطا اللہ،ایم اے،۱۹۴۵ء۔

۳۔ اقبال نامہ: حصہ دوم،مرتبہ،شیخ عطا اللہ،ایم اے،۱۹۵۱ء۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۴۔ مکاتیب اقبال: بنام خان محمد نیاز الدین خان، مرتبہ، بزمِ اقبال ۱۹۵۴ء۔

۵۔ مکتوباتِ اقبال: بنام سیّد نذیر نیازی، مرتبہ، نذیر نیازی، ۱۹۵۷ء۔

۶۔ انوارِ اقبال: مرتبہ، بشیر احمد ڈار، ۱۹۶۷ء۔

۷۔ Letters and Writings of Iqbal. : مرتبہ، بشیر احمد ڈار، ۱۹۶۷ء۔

۸۔ مکاتیب اقبال بنام گرامی: مرتبہ، محمد عبداللہ قریشی، ۱۹۶۹ء۔

۹۔ خطوط اقبال: مرتب، رفیع الدین ہاشمی، ۱۹۷۶ء۔

۱۰۔ کلیات مکاتیبِ اقبال: مرتب سید مظفر حسین برنی۔

سیّد سلیمان ندوی ایک کثیر الجہات اور کثیر المطالعہ شخص تھے۔انھوں نے اپنے آپ کو کسی ایک موضوع تک محدود نہیں رکھا۔ وہ بہ یک وقت سیرت نگار، مؤرخ، محقق اور نقاد تھے۔ان کو خط لکھنے والے مختلف موضوعات پر ان سے گفتگو کرتے اور رائے لیتے تھے۔اسی وجہ سے ان کے خطوط میں یکسانیت کی بجائے تنوع کا عنصر غالب ہے۔سنجیدگی چونکہ ان کی طبیعت کا حصہ تھی اور ان کے مکتوب نگار بھی اسی مزاج کے لوگ تھے اور ان کا مدعا صرف کسبِ فیض تھا اس لیے ان کے خطوط میں رنگا رنگی کے باجود متانت اور سنجیدگی کا عنصر غالب ہے۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق کے مکاتیب کے مندرجہ ذیل مجموعے شائع کیے جا چکے ہیں:

۱۔ مکتوباتِ بابائے اردو بنام حکیم محمد امامی، کراچی، ۱۹۶۰ء۔

۲۔ اردوئے معلیٰ، مرتب: سید ہاشمی فرید آبادی، لاہور، ۱۹۶۱ء۔

۳۔ مکتوباتِ عبدالحق، مرتب: جلیل قدوائی، کراچی، ۱۹۶۳ء۔

۴۔ خطوطِ عبدالحق، مرتب: محمد اکبر الدین صدیقی، حیدر آباد دکن، ۱۹۶۶ء۔

۵۔ خطوط بنام حسام الدین راشدی، قومی زبان: بابائے اردو نمبر ۱۹۶۴ء۔

۶۔ عبدالحق کے خطوط عبدالحق کے نام، مرتب: افضل العلما عبدالحق، کرنال، ۱۹۶۸ء

۷۔ خطوطِ عبدالحق بنام ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، لاہور ۱۹۷۷ء۔

۸۔ مکاتیبِ عبدالحق بنام مولوی محوی، مرتب: عبدالقوی دسنوی، کراچی، ۱۹۸۱ء۔

۹۔ خطوطِ عبدالحق بنام ڈاکٹر عبادت بریلوی، لاہور ۱۹۸۴ء۔

۱۰۔ خطوطِ عبدالحق بنام آلِ احمد سرور، کراچی ۱۹۹۸ء۔

۱۱۔ رقعاتِ عبدالحق، مرتب: بدر الدین، لاہور، ۲۰۰۴ء۔[۴۹]

رشید احمد صدیقی صاحبِ طرز انشا پرداز تھے۔شگفتہ مزاج اور بذلہ سنج انسان تھے۔ان کے ادبی ذوق اور روایت کے ڈانڈے علی گڑھ کی پختہ اور مستند ادبی راویت سے جا ملتے ہیں۔تحریروں میں ایک چھبتا ہوا طنز اور شگفتگی کا احساس ہمہ وقت موجود رہتا ہے اور یہی رشید احمد صدیقی کے اسلوب کی خاصیت ہے۔ان کے خطوط میں خط پڑھ کر پھاڑ دینے کی التجا کے علاوہ جو چیز نمایاں نظر آتی ہے وہ ان کی یہی شگفتہ مزاجی ہے جو ان سے مخصوص ہے۔پروفیسر نظیر صدیقی کو لکھتے ہیں:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

''حال ہی میں ایک صاحب سے کہہ دیا تھا کہ تصویر لے لیں۔ لے بھی لی۔ لیکن چند دن بعد یہ کہنے تشریف لائے کہ اچھی نہیں آئی۔۔۔۔ بہتیرا سمجھایا کہ اگر وہ میری تصویر لیں گے تو ہمیشہ یہی نقص اور دشواری پیش آئے گی تاوقتیکہ وہ کسی دوسرے کی تصویر لے کر اپنا اطمینان نہ کر لیں۔'' ۵۰

ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی زندگی کا زیادہ تر حصہ ملک سے باہر گزرا۔ اس دوران میں آپ ہمہ وقت تحقیق و تالیف اور تصنیف میں مگن رہے۔ اسلامی علوم مثلاً قرآنیات، سیرت، تاریخ تدوین حدیث، اور فقہ کی ترویج و ترغیب کی طرف خاص رجحان تھا۔ ان شعوری کارناموں کے علاوہ آپ نے اپنے خاندان، احباب اور دوسرے لوگوں کو خطوط بھی لکھے۔ ان خطوط سے آپ کے اسلامی میلان اور اسلامیات سے رغبت کا پتا چلتا ہے۔

''محمد حمید اللہ نے افرادِ خانہ کی دینی و مذہبی امور میں رہنمائی کے لیے مکتوب نگاری کو ذریعہ بنایا ۔۔۔ مختلف النوع علمی و فقہی استفسارات کے جوابات کے لیے بھی محمد حمید اللہ صاحب نے مکتوب نگاری کا سہارا لیا اور ہزاروں کی تعداد میں خطوط لکھے۔'' ۵۱

''خط انشاء جی'' کے میں وہی لطف اور شوخیِ تحریر ہے جو انشا جی کی طبیعت کا خاصہ ہے اور ہونی بھی چاہیے۔ چٹخارے دار اور دل چسپ جملوں کی قوس قزح ہے جو دل کو گدگداتی اور چٹکیاں بھرتی ہے اور ہونٹوں کو تبسم سے نوازتی ہے۔ رواں دواں ہلکے پھلکے خطوط ہیں، جن پر فکر اور فلسفے کا کوئی بار نہیں۔ دیگر تحریروں کی طرح انشا جی اپنے خطوط میں بھی ثقیل اور مشکل الفاظ لانے کا تکلف نہیں کرتے۔ سیدھے سادھے مضمون ہیں، چھوٹے چھوٹے جملے ہیں۔ ایک ہی نشست میں بغیر تھکاوٹ محسوس کیے پڑھتے جایئے اور حظ اُٹھایئے۔ قرۃ العین حیدر کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''اتنے سفرنامے ہو گئے ہیں کہ اب باہر جاتا ہوں تو امیگریشن والے حلف لیتے ہیں کہ آکر سفرنامہ نہیں لکھوں گا۔'' ۵۲

دل چسپ اور حیرت انگیز حقیقت یہ ہے کہ مکتوب نگاری کی اس معروف اور مستند روایت میں برِ صغیر پاک و ہند کی عورتوں نے بہت کم حصہ لیا، اور بہت کم خواتین نے خطوط کے مجموعے پیش کیے۔ ان کی تعداد اتنی کم ہے کہ اگر انگلیوں پر شمار کریں تو بہت سی انگلیاں بچ جائیں۔ اور تو اور عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر اور کشور ناہید جیسی بے باک قلم کار خواتین نے بھی اپنے پڑھنے والوں کو خطوط کا کوئی مجموعہ نہیں دیا۔ اگرچہ بُری عورت کے خطوط کے نام سے کشور ناہید کی کتاب موجود ہے لیکن ان میں خطوط نام کی کوئی چیز نہیں۔ وہ کشور ناہید کے ذاتی مشاہدے اور قلبی واردات کا اظہار یہ ہیں۔

یہ تصور تو سرے سے ہی غلط ہوگا کہ مندرجہ بالا خواتین کی کسی سے مراسلت نہ ہوگی۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر خط کتابت تھی تو وہ مکتوبات کہاں گئے؟ ان مکاتیب کے منظرِ عام پر نہ آنے کی صرف ایک وجہ ہی ہوسکتی ہے کہ خارجی طور پر اپنے زنانہ پن کو نظر انداز کرنے کے باوجود ان کے باطن میں ایک مشرقی عورت بہر حال موجود رہی اور برِ صغیر کے اس مردانہ معاشرے میں جہاں عورت آزاد خیال اور روشن خیال ہوتے بھی غیر مرد سے بالخصوص تنہائی میں ہم کلام ہوتے ہوئے جھجک محسوس کرتی ہے، ان کے اندر کی عورت ان خطوط کو جن میں مرد انھیں اور وہ مرد کو مخاطب کرتی ہیں، سامنے لانے کی ہمت پیدا نہ کرسکی۔ مکتوب نگار خواتین کے گنے چنے ناموں میں امرتا پریتم کے محبت نامے اور صفیہ جاں نثار اختر کے ''حرف آشنا'' اور ''زیرِ لب''

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خصوصیت کے حامل ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اردو ادب میں ذاتی اور گھریلو قسم کے خطوط میں خواتین تو خواتین کوئی مرد بھی صفیہ اختر سے بہتر خطوط نہ پیش کر سکا۔ صفیہ اختر کے خطوط کے مجموعوں کو صفیہ کے خطوط کا نام دے کر یک جا کر دیا گیا ہے۔ ان خطوط کو اردو ادب میں وہی حیثیت حاصل ہونی چاہیے جو انگریزی ادب میں جان کیٹس کے خطوط کو حاصل ہے جو اس نے اپنی محبوبہ فینی براؤن کے نام لکھے تھے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہاں مکتوب نگار ایک مرد جب کہ مکتوب الیہ ایک عورت ہے جب کہ یہاں معاملہ اس کے برعکس ہے، مکتوب نگار ایک عورت اور مکتوب الیہ اس کا شوہر ہے۔ اس فرق کے باوجود جو لپک، لذت اور سرشاری کیٹس کے خطوط میں ہے وہی صفیہ کے خطوط میں بھی ہے۔ ہمیں عالمی ادب کے سامنے مرزا غالب اور علامہ اقبال کے ساتھ ساتھ صفیہ کے خطوط کو بھی بلا جھجک رکھنا چاہیے۔ اگر صرف جذباتی لپک کی بنا پر کیٹس کے خطوط عالمی ادب میں شمار کیے جا سکتے ہیں تو پھر یقیناً عالمی ادب صفیہ کے خطوط کو بھی خوش دلی سے قبول کرے گا۔ گیتوں جیسے میٹھے اور رسیلے ان خطوط میں ایک مشرقی اور وفادار بیوی کا بڑا توانا پیکر موجود ہے، جو شوہر سے دور رہ کے بھی ہر لحہ شوہر کی خاطر داری اور دل داری میں مگن ہے اور اس کو اپنا جزوِ ایمان سمجھتی ہے۔ وہ اپنی جان پر ہزار ستم سہ رہی ہے لیکن اپنے شوہر کی بیماری پر تڑپ اٹھتی ہے۔ وہ شوہر کو حقیقی معنوں میں اپنا مجازی خدا تصور کرتی ہے۔ وہ بار بار اقرار کرتی ہے کہ اس کی حقیقی خوشی وہی ہے جو اس کے شوہر کی ہے۔ دوری، تنہائی، محرومی، کرب، والہانہ لگاؤ اور جذبات سے مملو یہ خطوط اس پر وقار محبت کے عکاس ہیں جو صفیہ کو اپنے شوہر جاں نثار اختر سے تھی۔ صفیہ کا تعلق اپنے خاوند کو سر کا تاج اور سائبان سمجھنے والی اس خوب صورت قابلِ تقلید نسوانی مشرقی روایت سے ہے، جس سے گھر کے اندر کی مقدس فضا معطر و منور اور پر سکون ہوا کرتی تھی اور جس کو ہمارے عہد کی پڑھی لکھی ان پڑھ عورت نفرت سے مرد کی غلامی کا نام دیتی ہے۔ اگر میں مشورہ دینے کی پوزیشن میں ہوتا تو جہیز میں والدین کو الا بلا دوسری چیزوں کے ساتھ بیٹی کو صفیہ کے خطوط بھی دینے کا مشورہ دیتا۔ اگر صفیہ کے یہ خطوط منظرِ عام پر نہ آتے تو شاید دو چار نسلوں کے بعد شوہر پرستی کی اس مشرقی روایت کی کوئی نمائندہ مثال اردو ادب میں نہ پائی جاتی۔ تقریباً ہر خط میں یہی مذکور ہے:

> ''اختر! میں کیا کروں کہ مجھے ہر لمحے یاد آتے ہو، اور میں تمھارے بغیر زندہ رہ کر کُل دنیا سے ایسی شرمندگی محسوس کرتی ہوں جیسے کسی گناہ کا ارتکاب کر رہی ہوں۔ اور پھر اندر اندر نہ جانے کیا شے بجھتی چلی جاتی ہے۔ دراصل میں زندہ ہی نہیں رہتی ہوں اختر! تم کیسے ہو، کیا کرتے ہو؟ کوئی تازہ نظم؟'' ۔ ۵۳

حیرت ہوتی ہے کہ امرتا پریتم جیسی ادیبہ کے خطوط میں کسی علمی و ادبی بحث کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ اگر کہیں پر کسی فلم، نظم یا کسی دوسری تحریر کا ذکر آیا بھی ہے تو محض مصروفیت کی روداد کے طور پر۔ ان خطوط میں عامیانہ قسم کی وقتی مسرت، دوانگی اور خود سپردگی نمایاں طور پر موجود ہے۔ یہ سطحی قسم کے عام سے خطوط ہیں، جو امرتا کے وقار اور ادبی قد و قامت سے کسی طور بھی لگّا نہیں کھاتے بلکہ اُس کی شخصیت کو مجروح کرتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی ٹین ایج لڑکی چھپ چھپ کر فلمی انداز میں اپنے بوائے فرینڈ کو محبت بھرے خط لکھ رہی ہے۔ وہ خط کا اختتام مختلف ناموں سے، تمھاری امرتا، ہمیشہ سے تمھاری آشی، تمھاری ماجا، اور تمھاری زوبی اور تمھاری بیگم وغیرہ سے کرتی ہے اور مشرقی تہذیب کو جوتے کی نوک پر مارتی ہے۔ ممکن ہے یہ خطوط آج کل کے مادر پدر آزاد اور روشن خیال معاشرے میں یہ کوئی انہونی بات نہ ہوں لیکن یہ تو اس زمانے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی بات ہے جب باپردہ عورت کا بھی باہر نکلنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ یوں ان مکاتیب میں ایک روایت سے بغاوت کے علاوہ اور کوئی خاص بات نہیں۔ کاش یہ خطوط شائع نہ ہوتے، لکھتی ہیں:

"تمھارے بغیر مجھے کوئی بھی جگہ اچھی نہیں لگتی۔ مجھے غیر ملکی شہرت نہیں چاہیے۔ میں نے جس کے لیے محبت کے گیت لکھے، اگر اسے میرے گیت قبول نہیں تو بیگانوں سے ان گیتوں کی تعریف پا کر کیا کروں گی۔؟"[۵۴]

حواشی:

۱۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ، وجہی سے عبدالحق تک، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۲۵۹۔
۲۔ بشیر احمد ڈار، انوارِ اقبال، اقبال اکادمی، کراچی، ۱۹۶۹ء، ص ۱۱۔
۳۔ ممتاز حسن، مشمولہ خطوطِ اقبال، مرتب: رفیع الدین ہاشمی، مکتبہ خیابانِ ادب، لاہور، ۱۹۷۶ء، ص ۱۔
۴۔ رشید حسن خاں، مضمون: ذاتی خطوں سے چند معروضات، سہ ماہی فنون، لاہور، ستمبر تا دسمبر، ۱۹۹۲ء، ص ۳۹۔
۵۔ ڈاکٹر صادق علی گل، فنِ تاریخ نویسی (ہومر سے ٹائن بی تک)، اشاعت اول، ایم پوزیم، لاہور، ۱۹۹۸ء۔
۶۔ سہیل قریشی، غداروں کے خطوط، جلد اول، نگارشات، ۳۔ٹمپل روڈ، لاہور، ص ۱۸۹۔
۷۔ حضرت علامہ جلال الدین سیوطی، تاریخ الخلفا (مترجم: محمد الیاس عادل) مشتاق بک کارنر، لاہور، س ن، ص ۳۲۰۔
۸۔ محمد قاسم فرشتہ، تاریخ فرشتہ، جلد اول (مترجم، عبدالحی خواجہ)، شیخ غلام حسین اینڈ سنز، لاہور، س ن، ص ۶۴۳۔
۹۔ سیّد مرتضیٰ حسین فاضل، اردوئے معلّٰی، جلد اول، مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۳۲۰۔
۱۰۔ خلیق انجم (مضمون) غالب کی مکتوب نگاری، مرتب: پروفیسر نذیر احمد، غالب انسٹیٹیوٹ، نئی دہلی، ۲۰۰۳ء، ص ۵۷۔
۱۱۔ خلیق انجم (مضمون)، مشمولہ غالب کی مکتوب نگاری، مرتب: پروفیسر نذیر احمد، ص ۶۵۔
۱۲۔ شاداں بلگرامی، روح المطالب فی شرح دیوانِ غالب، شیخ مبارک علی، لاہور، ۱۹۶۷ء، ص ۶۵۔
۱۳۔ خلیق انجم (مضمون)، مشمولہ غالب کی مکتوب نگاری، مرتب: پروفیسر نذیر احمد، ص ۶۰۔
۱۴۔ محمد عبداللہ قریشی، روحِ مکاتیبِ اقبال، اقبال اکادمی لاہور، نومبر ۱۹۷۷ء، ص ۶۵۔
۱۵۔ سیّد سلیمان ندوی: دیباچہ، مکاتیبِ شبلی، حصہ اول، طبع اول، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۸۹ء۔
۱۶۔ ذوالفقار علی خان، مشاہیر کے خطوط بنام خواجہ محمد اسد، تحقیقی مقالہ برائے ایم فل اردو، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد۔ ۲۰۰۳ء، ص ۵۷۔
۱۷۔ انور سدید، وزیر آغا کے خطوط، مکتبہ فکر و خیال، اقبال ٹاؤن لاہور، طبع اول، مارچ ۱۹۸۵ء، ص ۶۹۔
۱۸۔ ڈاکٹر گیان چند جین، تحقیق کا فن، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۲ء، ص ۳۳۸۔
۱۹۔ مولانا نعمان اعظمی، تبرکاتِ نبوی کی تاریخی دستاویز، مرکزِ اہلِ سنت برکاتِ رضا، گجرات (انڈیا)، ۲۰۰۶ء، ص ۲۳۵
۲۰۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری، غالب۔ فکر و فن، انجمن ترقیِ اردو، کراچی، ۱۹۶۱ء، ص ۲۶۴۔
۲۱۔ اشفاق احمد، مشمولہ خط، تحقیق نامہ، ۲۰۰۵۔ ۲۰۰۶ء، شعبہ اردو، جی سی یونی ورسٹی، لاہور، ص ۳۴۲۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۲۲۔ عبدالعزیز ساحر، ڈاکٹر غلام جیلانی برق کے خطوط، حسنین پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۹ء، ص ۴۰۔

۲۳۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ (مضمون) اردو خط نگاری، نقوش مکاتیب نمبر، مدیر: محمد طفیل، ادارہ فروغِ اردو، انارکلی لاہور، نومبر ۱۹۵۷ء، ص ۱۴۔

۲۴۔ معین الدین انصاری، شبلی مکاتیب کی روشنی میں، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۶۷ء، ص ۲۵۳۔

۲۵۔ شیخ محمد اکرام، موجِ کوثر، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، اکیسواں ایڈیشن، ۲۰۰۰ء، ص ۲۲۴۔

۲۶۔ محمد عالم مختار حق، گنجینۂ مہر، جلد اول، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، اگست ۲۰۰۸، ۱۹۱۔

۲۷۔ مولانا ابوالکلام آزاد، غبارِ خاطر، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، س ن، ص ۹۔

۲۸۔ خواجہ عبدالرشید، سیرِ فرنگ، کتب خانہ شانِ اسلام، اردو بازار لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۱۔

۲۹۔ مولانا سید محمد میاں، تحریک ریشمی رومال، مکتبہ محمودیہ، کریم پارک، لاہور اکتوبر ۱۹۹۹ء، ص ۱۸۳۔

۳۰۔ محمد طفیل: پیش لفظ، نقوش مکاتیب نمبر، ادارہ فروغِ اردو، انارکلی لاہور، نومبر ۱۹۵۷ء، ص ۱۰۔

۳۱۔ ڈاکٹر شمس المصباحی پورنوی، مکاتیبِ رضا، مکتبہ بحرالعلوم، گنج بخش روڈ، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۲۵۔

۳۲۔ سید مرتضیٰ حسین فاضل، اردوئے معلےٰ، جلد اول، مجلس ترقیِ ادب، لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۳۱۔

۳۳۔ WWW.English history.net \ letters \ brawne-13

۳۴۔ جاوید طفیل (مضمون) تحقیق نامہ، مدیر: ڈاکٹر سلیم ملک، ۲۰۰۶، ۲۰۰۵، شعبہ اردو، جی سی، یونی ورسٹی، لاہور۔

۳۵۔ سیّد پیر مہر علی شاہ، مکتوباتِ طیبات معروف بمہر چشتیہ، گولڑا شریف، اکتوبر ۱۹۹۸ء، ص ۱۴۵۔

۳۶۔ محمد حمید شاہد/محمد عمر میمن، کہانی اور یوسا کا معاملہ، مثال پبلشرز، امین پور بازار، فیصل آباد، ۲۰۱۱ء، ص ۴۱۔

۳۷۔ قرآن مجید، سورہ النمل۔

۳۸۔ کتابِ مقدس، پاکستان بائبل سوسائٹی، انارکلی، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۲۰۵۔

۳۹۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، نصف الملاقات، بیکن بکس، اردو بازار لاہور۔ ۲۰۰۵ء۔

۴۰۔ سیّد محبوب رضوی، مکتوباتِ نبوی، یونائیٹڈ آرٹ پرنٹرز، ایبٹ روڈ، لاہور، ستمبر ۱۹۸۵ء، ص ۴۲۔

۴۱۔ حکیم نبی احمد خاں رامپوری، مکتوباتِ حضرت علی، اشاعت ششم، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، جون ۱۹۸۹ء، ص ۱۷۹۔

۴۲۔ ابوالفضل، رقعاتِ ابوالفضل، مطبع منشی نول کشور، کان پور، ۱۹۸۱، ص ۱۲۔

۴۳۔ حامد حسن قادری، داستانِ تاریخِ اردو، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ص ۲۳۲۔

۴۴۔ سیّد مرتضیٰ حسین فاضل، اردوئے معلےٰ، جلد اول، مجلس ترقیِ ادب، لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۳۵۷۔

۴۵۔ سیّد مرتضیٰ حسین فاضل، اردوئے معلےٰ، جلد اول،، ۱۹۶۹، ص ۳۶۰۔

۴۶۔ سیّد مرتضیٰ حسین فاضل، اردوئے معلےٰ، جلد دوم مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور، ۱۹۶۹، ص ۴۷۴۔

۴۷۔ اسماعیل پانی پتی، خطوط بنام سرسیّد مجلسِ ترقیِ ادب لاہور، جون ۱۹۹۵ء، ص ۲۷۲۔

۴۸۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، خطوطِ اقبال، اشاعتِ اول، مکتبہ خیابانِ ادب لاہور، ۱۹۷۶ء، ص ۴۶۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۴۹۔ (افضل حق قریشی، (مضمون) مشمولہ مباحث، مکاتیبِ بابائے اردو بنام ڈاکٹر سید عبداللہ، جنوری تا جون ۲۰۱۲ء۔

۵۰۔ لطیف الزماں خاں، خطوطِ رشید احمد صدیقی، جلد اول، مجلس ادبیاتِ مشرق، کراچی، ۱۹۸۸ء۔

۵۱۔ محمد ارشد، مضمون: ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے چند غیر مطبوعہ خطوط، سہ ماہی پیغام آشنا، شمارہ۔۳۴، جولائی تا ستمبر، ۲۰۰۸ء، ص ۱۹۷۔

۵۲۔ ریاض احمد ریاض، خط انشا جی کے، اشاعت دوم، لاہور اکیڈمی سرکلر روڈ لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۱۹۷۔

۵۳۔ صفیہ اختر، صفیہ کے خطوط جاں نثار اختر کے نام، ترتیب پبلشرز، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور، سنِ اشاعت ندارد، ص ۹۸۔

۵۴۔ امرتا پریتم، محبت نامے، مکتبہ اردو ادب لوہاری گیٹ لاہور، س ن، ص ۳۰۔

فہرستِ اسنادِ محولہ:

۱۔ ابوالفضل، (مرتب: ۱۹۸۱ء)، ''رقعاتِ ابوالفضل''، نول کشور، کان پور۔

۲۔ آزاد، ابوالعلام، مولانا، (سن ندارد)، ''غبارِ خاطر''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔

۳۔ صفیہ اختر، (سن ندارد)، ''صفیہ کے خطوط جاں نثار اختر کے نام''، ترتیب پبلشرز، لاہور۔

۴۔ خلیق انجم، (۲۰۰۳ء)، ''غالب کی مکتوب نگاری''، مشمولہ: احمد، نذیر، غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی۔

۵۔ انصاری، معین الدین، (۱۹۶۷ء)، ''شبلی مکاتیب کی روشنی میں''، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی۔

۶۔ بلگرامی، شاداں، (۱۹۶۷ء)، ''روح المطالب فی شرح دیوانِ غالب''، شیخ مبارک علی، لاہور۔

۷۔ پانی پتی، اسماعیل، (مرتب: ۱۹۹۵ء)، ''خطوط بنام سرسید''، مجلس ترقی ادب، لاہور۔

۸۔ امرتا پریتم (سن ندارد)، ''محبت نامے''، مکتبۂ اردو ادب، لاہور۔

۹۔ پورنوی، شمس المصباحی، (۲۰۰۵ء)، ''مکاتیبِ رضاً، مکتبۂ بحرالعلوم، لاہور۔

۱۰۔ گیان چند، (۲۰۰۲ء)، ''تحقیق کا فن، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد۔

۱۱۔ میمن، محمد عمر، شاہد حیدر، (۲۰۱۱ء)، ''کہانی اور یوسا کا معاملہ''، امثال پبلشرز، فیصل آباد۔

۱۲۔ خاں، لطیف الزماں، (۱۹۸۸ء)، ''خطوطِ رشید احمد صدیقی''، مجلس ادبیاتِ مشرق، جلد دوم، کراچی۔

۱۳۔ دار، بشیر احمد، (۱۹۶۹ء)، ''انوارِ اقبال''، اقبال اکادمی، کراچی۔

۱۴۔ رام پوری، حکیم نبی احمد خاں، (۱۹۸۹ء)، ''مکتوباتِ حضرت علی''، چھتیسویں اشاعت، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور۔

۱۵۔ ریاض، ریاض احمد، (۱۹۸۸ء)، ''خط انشا کے''، لاہور اکیڈمی، دوسری اشاعت، لاہور۔

۱۶۔ ساحر، عبدالعزیز، (۱۹۹۹ء)، ''ڈاکٹر غلام جیلانی برق کے خطوط''، حسنین پبلی کیشنز، لاہور۔

۱۷۔ سبزواری، شوکت، (۱۹۶۱ء)، ''غالب۔ فکروفن''، انجمن ترقی اردو، کراچی۔

۱۸۔ انور سدید (۱۹۸۵ء)، ''وزیر آغا کے خطوط''، مکتبۂ فکروخیال، لاہور۔

۱۹۔ ندوی، سلیمان، سید، (۱۹۸۹ء)، ''مکاتیبِ شبلی''، نیشنل بک فاؤنڈیشن، پہلی اشاعت، اسلام آباد۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۲۰۔ سیوطی، جلال الدین، (سن ندارد)، ''تاریخ الخلفا''، مترجم: الیاس عادل، محمد، مشتاق بک کارنر، لاہور۔

۲۱۔ عبداللہ، سید، (۲۰۰۳ء)، ''وجہی سے عبدالحق تک''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔

۲۲۔ قریشی، عبداللہ، (۱۹۷۷ء)، ''روح مکاتیبِ اقبال''، اقبال اکادمی، لاہور۔

۲۳۔ عبدالرشید، خواجہ، (۱۹۸۳ء)، ''سیر فرنگ''، کتب خانہ شان اسلام، لاہور۔

۲۴۔ علی شاہ، پیر مہر، سید (۱۹۹۸ء)، ''مکتوباتِ طیبات معروف بہ مہر چشتیہ''، گولڑا شریف ۔۔۔۔

۲۵۔ فاضل، سید مرتضی حسین، (۱۹۶۹ء)، ''اردوے معلیٰ''، جلد اول مجلس ترقی ادب، لاہور۔

۲۶۔ فتح پوری، فرمان، (۲۰۰۵ء)، ''نصف الملاقات''، بیکن بکس، لاہور۔

۲۷۔ فرشتہ، محمد قاسم، (سن ندارد)، ''تاریخ فرشتہ''، جلد اول، مترجم: خواجہ عبدالحی شیخ غلام حسین اینڈ سنز، لاہور۔

۲۸۔ قادری، حامد حسن، (۱۹۷۶ء)، ''داستانِ تاریخِ اردو''، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی۔

۲۹۔ قریشی، سرل، (سن ندارد)، ''غداروں کے خطوط''، جلد اول، نگارشات، لاہور۔

۳۰۔ گل، صادق علی، (۱۹۹۸ء)، ''فن تاریخ نویسی (ہومر سے ٹائن بی تک)''، ایم پوزیم، پہلی اشاعت، لاہور۔

۳۱۔ محمد اکرم، شیخ، (۲۰۰۰ء)، ''موجِ کوثر''، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، اکیسویں اشاعت، لاہور۔

۳۲۔ محمد میاں، مولانا سید، (۱۹۹۹ء)، ''تحریک ریشمی رومال''، مکتبہ محمودیہ، لاہور۔

۳۳۔ محبوب رضوی، سید، (۱۹۸۵ء)، ''مکتوبات دیبنوی''، یونائیٹڈ آرٹ پرنٹرز، لاہور۔

۳۴۔ مختار حق، محمد عالم، (۲۰۰۸ء)، ''۔۔۔۔۔۔''، جلد اوّل، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور۔

۳۵۔ نعمان اعظمی، مولانا، (۲۰۰۶ء)، ''تبرکات نبوی کی تاریخی دستاویز''، مرکز اہل سنت برکات رضا، گجرات، بھارت۔

۳۶۔ ہاشمی، رفیع الدین، (۱۹۷۶ء)، ''خطوط اقبال''، مکتبۂ خیابان ادب، پہلی اشاعت، لاہور۔

کتب مقدس:

۳۷۔ قرآن مجید، سورۃ النمل

۳۸۔ کتابِ مقدس، پاکستان بائبل سوسائٹی، (مرتب: ۲۰۰۸ء)، لاہور۔

غیر مطبوعہ مقالہ:

۳۹۔ خان، ذوالفقار، ۲۰۰۳ء)، ''مشاہیر کے خطوط بنام خواجہ اسد''، مقالہ برائے ایم۔فل اردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد۔

رسائل:

۴۰۔ احمد، اشفاق، (۲۰۰۶ء۔۲۰۰۵ء)، ''مشمولہ خط''، ''تحقیق نامہ''، شعبۂ اردو جی سی یونیورسٹی، لاہور۔

۴۱۔ محمد ارشد، (۲۰۰۸ء)، ''ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے چند غیر مطبوعہ خطوط''، پیغام آشنا، سہ ماہی، شمارہ ۳۴، جولائی تا ستمبر، ایرانی فرہنگی جمہوری اسلام ایران، اسلام آباد۔

۴۲۔ خان، حسن، رشید، (۱۹۹۱ء)، ''ذاتی خطوں سے چند معروضات''، فنون، سہ ماہی، ستمبر تا دسمبر، لاہور۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۴۳۔ جاوید طفیل، (۲۰۰۶ء۔۲۰۰۵ء)، تحقیق نامہ، شعبہ اردو جی سی یونیورسٹی، لاہور۔

۴۴۔ محمد طفیل، (نومبر ۱۹۵۷ء)، ''پیش لفظ''، نقوش (مکاتیب نمبر)، ادارہ فروغ اردو، لاہور۔

۴۵۔ عبداللہ، محمد، سید، (۱۹۵۷ء)، ''اردو خط نگاری''، مشمولہ: نقوش (مکاتیب نمبر)، ادارہ فروغ اردو، لاہور۔

۴۶۔ قریشی، افضل حق، (۲۰۱۲ء)، ''مکاتیب بابائے اردو بنام ڈاکٹر سید عبداللہ''، مباحث، جنوری تا جون، لاہور۔

© rasailojaraid.com